عکس

امجد اسلام امجد

عکس

جدید عربی نظموں کا منظوم ترجمہ

امجد اسلام امجد

سنگِ میل پبلی کیشنز ○ لاہور

۱۹۹۱ء

پبلشرز۔ نیاز احمد

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

تعداد: ایک ہزار

قیمت ۶۰/۰۰ روپے

زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

تحریکِ آزادئ فلسطین

کے نام

جو اِن نظموں کا سرچشمہ ہے

PALESTINE LIBERATION ORGANIZATION
PAKISTAN OFFICE

No. 58, STREET No. 27
SHALIMAR 6-2, P. O. BOX No. 1061
ISLAMABAD

PHONE : 24013

منظمة التحرير الفلسطينية
مكتب باكستان
اسلام آباد

ان مكتب منظمة التحرير الفلسطينيه فى باكستان يبجل الخطوه الرائعه التى اتاح بها الشاعر الباكستانى امجد اسلام امجد للشعب الباكستانى بقراءه الشعر العربى الفلسطينى المعاصر من خلال ترجمته نخبه من الشعر الفلسطينى الى الاردو

ان الشعب الفلسطينى وثورته المسلحه طليعه متقدمه وفى الخندق الاول فى العالم للدفاع عن قضايا الحريه والعداله والادب الفلسطينى شعرا ام نثرا هو معبرا حقيقى عن اصاله وعداله هذا النضال .

وجاءت خطوه الشاعر الباكستانى السيد امجد لتنقل الى الشعب الباكستانى الشقيق شعله النضال الفلسطينى العادل من خلال الشعر الفلسطينى معبرا عن الاهداف المشتركه التى تربط الشعبين الباكستانى والفلسطينى

اننى باسم منظمه التحرير الفلسطينيه وبالنيابه من الكتاب الفلسطينيين اشكر واقدر الشاعر الباكستانى السيد امجد اسلام امجد على هذا العمل والانجاز الكبير والذى يمثل الحس الصادق الذى يربط الشعب الباكستانى والشعب الفلسطينى .

اننا نتطلع الى علاقات قريبه بين الكتاب الفلسطينين والباكستانين لخدمه قضا الانسانيه وقضايا الشعوب التى تناضل من اجل حريتها وكرامتها .

اننى على ثقه بان هذا الكتاب سوف يمكن القارى الباكستانى من الاضطلاع على النضال الطويل الشاق الذى يخوضه اخوانهم الفلسطينيون من اجل اعاده المقدسات الاسلاميه فى فلسطين

تنظیمِ آزادیٔ فلسطین

پاکستان آفس، اسلام آباد

پاکستانی شاعر امجد اسلام امجد نے فلسطینی شاعری کا اردو نظم میں ترجمہ کر کے اہلِ پاکستان کو دورِ حاضر کی عرب فلسطینی شاعری سے آگاہ ہونے کا جو موقع فراہم کیا ہے، تنظیمِ آزادیٔ فلسطین اُسے قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔

فلسطینی عوام کا مسلح انقلاب، آزادی اور انصاف کے تحفظ کے لیے آج دنیا میں سب سے پیش پیش اور اگلے مورچوں پر سینہ سپر ہے۔ اور فلسطینی ادب چاہے وہ منثور ہو یا منظوم، اس جدوجہد کے خلوص اور سچائی کا آئینہ دار ہے۔

پاکستانی شاعر جناب امجد جس طرح سے فلسطینی جنگِ آزادی کا یہ روشن شعلہ پاکستان عوام کے سامنے لے آئے ہیں، اُس سے اُن مشترکہ مقاصد کی نشاندہی ہوتی ہے جنہوں نے پاکستان اور فلسطین کے عوام کو ایک رشتے میں منسلک کر رکھا ہے۔

میں تنظیمِ آزادیٔ فلسطین اور فلسطینی ادبا کی طرف سے جناب امجد اسلام امجد کو ان کے اس کارنامے پر تشکر و تحسین پیش کرتا ہوں۔ ان کا یہ کام اس سچے احساس کی نمائندگی کرتا ہے جو پاکستان اور فلسطین کے لوگوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ آیندہ فلسطینی اور پاکستانی ادبا کے درمیان مضبوط رشتے استوار ہوں گے، اور وہ مل کر انسانیت اور اپنی آزادی اور آبرو کے لیے لڑنے والی قوموں کے مسائل کے لیے جدوجہد کریں گے۔

مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کی بدولت پاکستان کے قاری کو اس طویل اور پُرمشقت جدوجہد کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوں گی جو ان کے فلسطینی بھائیوں نے ارضِ فلسطین میں، مقدس اسلامی آثار کی واپسی کے لیے، برپا کر رکھی ہے۔

علی حجّاج

ناظم دفتر تنظیم آزادیٔ فلسطین

اسلام آباد۔ پاکستان

فہرست

محمود درویش

محمود درویش

محمود درویش

محمود درویش

سمیح القاسم

سمیح القاسم

فدویٰ طوقان

عکس در عکس

"عکس" میں شامل نظمیں میں نے گذشتہ چار برسوں میں ترجمہ کی ہیں۔ متن اور ترجمے کی موجودگی اور سید محمد کاظم صاحب کے اس زبردست مقدمے کے بعد اصولی طور پر میرے لیے کچھ کہنے کو باقی نہیں رہتا لیکن جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، ایک سفر کے اختتام پر جہاں اس کی تھکن خوشبو میں تحلیل ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، وہاں رستوں میں چھوڑی ہوئی منزلیں بھی ایک ایک کر کے آنکھوں میں تیر جاتی ہیں۔ یہ چند سطور اسی احساس کی عطا ہیں۔

میں نے یہ نظمیں "ترجمہ برائے ترجمہ" کی خاطر نہیں کیں۔ میرے سامنے ایک واضح مقصد تھا اور وہ یہ کہ بیسویں صدی کے نصف آخر کے ایک شاعر کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ میں شاعری کے ذریعے اپنے وطن، قوم اور عالمی انسانی برادری سے نہ صرف اپنا تخلیقی تعلق قائم کروں، بلکہ دنیا میں برپا عظیم اقداری کشمکش میں بھی ترقی پسند، عوام دوست اور انقلابی قوتوں کا ساتھ دوں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے لیے میں نے شاعری کے ترجمے، اور خصوصاً فلسطینی شاعری کے ترجمے، کو کیوں اختیار کیا؟ پہلی بات کی وضاحت تو میں یوں کروں گا کہ میں خود شاعر ہوں اور شاعری کے ذریعے میرے لیے مسائل اور اشیا کی افہام و تفہیم نسبتاً بہتر، جامع اور آسان ہے اور یوں بھی شاعری انسانی جذبوں کی آواز ہے اور جذبے بہت کم جھوٹ بولتے ہیں۔ باقی رہی فلسطینی شاعری کے انتخاب کی بات تو وہ یوں ہے کہ ایک پاکستانی مسلمان ہونے کی حیثیت سے عالمی انسانی جدوجہد میں فلسطین میرے اپنے گروہ کی پہچان ہے اور فلسطینی عوام کی جدوجہد میرے لیے، پاکستان کے

بعد، سب سے اہم تاریخی استعارہ ہے۔ تیسری دنیا کے عوام کی سیاسی اور طبقاتی بیداری کے عمل میں بلاشبہ فلسطین تمام مسلمان ملکوں سے کہیں آگے ہے۔ میرے نزدیک اس عظیم انسانی جدوجہد میں مقدور بھر حصہ لینے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اپنے اور اپنے جیسے آدم زادوں کے خیالات ایک دوسرے تک پہنچائے جائیں۔ ان ترجموں میں فلسطینی عوام کی جدوجہد کی جو تصویریں آپ کو نظر آئیں گی، انہیں زمان و مکاں کی معمولی سی تبدیلی کے بعد آپ پوری تیسری دنیا میں کہیں بھی دیکھ سکتے ہیں۔

یہ ترجمے کیسے ہیں، اس کا فیصلہ تو اس کتاب کے قارئین ہی کر سکتے ہیں۔ میں تو صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنی طرف سے انھیں بہتر اور خوب صورت بنانے کی بساط بھر کوشش کی ہے۔ اس دوران میں کچھ مہربانوں کے اُڑتے ہوئے جملے بھی مجھ تک پہنچتے رہے ہیں کہ "جب شاعری ختم ہو جائے تو آدمی ترجمے شروع کر دیتا ہے" یا "شاعری کا شاعری میں ترجمہ تو ممکن ہی نہیں ہے" یا یہ کہ "جو زبان مترجم کو پوری طرح آتی ہی نہیں اس سے وہ اچھا ترجمہ کس طرح کر سکتا ہے" اور یہ کہ میں نے ان ترجموں کو اپنی نظمیں بنا دیا ہے وغیرہ۔

میں ان اعتراضات کا کوئی جواب اس لیے نہیں دینا چاہتا کہ ہمارے یہاں سنجیدگی سے کیے جانے والے ہر کام پر اسی طرح کی باتیں ہوتی ہیں۔ تنقید کرنے والوں کی اس "اقلیت" کے پاس ایک یہی ہنر ہے اور میں انھیں ان کے واحد سہارے سے محروم نہیں کرنا چاہتا۔

مجھے عربی زبان بہت واجبی سی آتی ہے۔ اس صورت میں شاید مجھے اس کام کو ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے تھا، لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے، میں نے اسے شوق سے زیادہ اپنا فرض سمجھا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ عرب شاعروں کے ہاں مجھے جذبات کی جو شدت اور خوب صورتی نظر آئی ہے اس کے پیشِ نظر ان نظموں کے بطن تک رسائی حاصل کرنا کم از کم مجھے کوئی خاص مشکل نہیں لگا۔ عربی سے براہ راست نثری ترجمے جناب سید محمد کاظم صاحب نے کیے ہیں۔ انھوں نے صرف خوبصورت اور بلیغ نثری ترجمہ کرنے پر ہی بس نہیں کیا بلکہ اپنی شدید

مصروفیات کے باوجود ہر نظم پر شعری ترجمے سے پہلے اور بعد میں کئی کئی گھنٹے مجھ سے تبادلۂ خیال بھی کیا ہے اور اس طور ان کے متن کی صحت کو برقرار رکھنے اور ترجمے کو اصل نظم کے حدود میں پابند رکھنے کے سلسلے میں میری بے حد مدد کی ہے۔ اس عنایت کے لیے میں اپنے دل کی تہوں سے ان کا ممنون ہوں۔

میں نے کوشش کی ہے کہ لفظی ترجمے کے بجائے شاعر کے مافی الکلام کی ترجمانی کی جائے۔ اس طور یہ تراجم "آزاد ترجمے" کی ذیل میں آتے ہیں۔ اگر صاحبانِ نظر کے نزدیک کہیں کہیں آزادی ضرورت سے زیادہ ہوگئی ہو تو معذرت خواہ ہوں اور ملتمس ہوں کہ ایسے مقامات کی نشاندہی کردی جائے تاکہ آیندہ اشاعت میں مناسب تصحیح کی جائے۔

میں مجلس ترقی ادب لاہور کا بھی شکر گزار ہوں کہ اس نے اس کتاب کو اشاعت کے لیے انتخاب کیا۔

امجد اسلام امجد

۶۵۔ فلیمنگ روڈ۔ لاہور

محمد کاظم

مقدمہ

یہ مجموعہ زمانۂ حال کی عربی شاعری کا ایک مختصر، لیکن ایک اعتبار سے نمائندہ انتخاب ہے، جسے ہماری نوجوان نسل کے ذہین اور باصلاحیت شاعر امجد اسلام امجد نے اپنے ملک کے قارئین کے لیے اردو نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ عربی شاعری کے ان منظوم ترجموں میں سے بیشتر زمانۂ قریب میں ماہنامہ "فنون" اور "صحیفہ" اور روزنامہ "امروز" اور نوائے وقت" کے صفحات پر شائع ہوئے تھے اور پڑھنے والوں نے ان کے اندر جذبے کا تموّج، خیال کی ندرت اور اظہار کا ایک غرابت آمیز (Exotic) پیرایہ دیکھا، اور اس وجہ سے ان کو پسند کیا تھا ـــ اب وہ سب نظمیں، کچھ اور نظموں کے اضافے کے ساتھ، اس کتاب میں یکجا پیش کی جا رہی ہیں۔

اس مجموعے میں شامل نظموں کو ہم جدید ـــ بلکہ جدید تر عربی شاعری بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ 'جدید' ایک اضافی اصطلاح ہے اور مرورِ زمانہ کے ساتھ اس کی تعبیر بدلتی رہتی ہے۔ چنانچہ لفظ 'جدید' کے استعمال سے بعض اوقات ـــ اچھا خاصا التباس Confusion بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ عربی شاعری کے ساتھ 'جدید' کی یہ صفت تقریباً ایک صدی قبل لگنی شروع ہوئی تھی اور اب تک چلی آتی ہے! ـــ ایک زمانے میں مصر کے محمود سامی البارودی (۱۸۳۹ - ۱۹۰۴ء) 'جدید' کہلائے تھے، بلکہ سچ یہ ہے کہ ایک

طویل عرصۂ انحطاط کے بعد عربی شاعری کی نشاۃ ثانیہ انہی کے ہاتھوں سے ہوئی۔ انیسویں صدی کی آخری اور بیسویں صدی کی پہلی چوتھائی محمود سامی البارودی اور اسماعیل صبری (۱۸۶۱ء۔ ۱۹۲۳ء) کا عہد تھا، جس میں عربی شاعری نے پانچ سو برس کے عصرِ خوابیدگی Hibernation کے بعد انگڑائی لی تھی، اور بارودی کی نظمیں اپنے محاورے اور حسنِ بندش میں عباسی دور کی شاعری کی یاد دلانے لگی تھیں۔ لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ بارودی اور صبری بھی پرانے ہو گئے اور جدید عربی شاعری اب وہ کہلائی جو مصر کے احمد شوقی اور حافظ ابراہیم، لبنان کے خلیل مطران اور عراق کے معروف الرصافی کا طرزِ سخن تھی۔ ان لوگوں نے عربی شاعری کی اس نئی روایت کو آگے بڑھایا اور بلاغتِ لفظ کا دامن حسنِ خیال سے باندھتے ہوئے اس میں اظہار کے ایسے خوب صورت تجربے کیے کہ دنیائے ادب میں عربی شاعری کا کھویا ہوا وقار بحال ہو گیا۔ شاعروں میں احمد شوقی (۱۸۶۸ - ۱۹۳۲ء) کا جینئس اپنے ہم عصروں کے درمیان اسی طرح نمایاں اور قد آور ہے جس طرح ہمارے ہاں علامہ اقبالؒ کا ہے (اور اتفاق سے ان دونوں کا زمانہ بھی تقریباً ایک ہی ہے)۔ شوقی کے بعد لوگ سوچتے تھے کہ فن کی اس معراج پر پہنچ جانے کے بعد اب شاعری کے لیے کون سے افلاک باقی رہ گئے ہیں جنھیں یہ مسخر کرے گی۔ لیکن جب تک انسان کی تقدیر میں ارتقا لکھا ہے، اس کی شاعری ہو یا کوئی دوسرا فن، اس میں آخری منزل کبھی نہیں آ سکتی! چنانچہ زمانے نے کروٹ لی تو شوقی اور حافظ پر بھی وقت کی گرد جمنے لگی، ادب کے افق پر اب کچھ دوسرے اصحابِ سخن نمودار ہوئے، جنھوں نے عربی شاعری کو ایک نیا لحن اور ایک تازہ لب و لہجہ دیا۔ جبران خلیل جبران، میخائیل نعیمہ، ایلیا ابو ماضی اور الیاس ابو شبکہ —— یہ سب لبنان سے تعلق رکھتے تھے، لیکن حالات سے مجبور ہو کر اپنے وطن سے ہجرت کر کے یورپ اور امریکہ میں جا بسے۔ اور شعراء المہجر (ہجرت کے شعراء) کہلائے۔ زندگی کے مغربی سانچے اور سوچ و فکر کے انگریزی اور فرانسیسی انداز نے ان لوگوں کے واسطے سے عربی شاعری کو نمایاں طور پر متاثر کیا اور اپنے

زمانے میں ان لوگوں کا حلقہ بھی بجا طور پر شاعری کا 'جدید سکول' قرار پایا۔ تجدد و ارتقا کا یہ دھارا اسی طرح وقت کے ساتھ ساتھ چلا جاتا ہے اور ہر جدید شاعر اور ایک جدید تر شاعر کے لیے جگہ خالی کرتا جاتا ہے۔ چنانچہ اس صدی کی وسطی دہائیوں میں کچھ اور نام مثلاً احمد زکی ابو شادی، عبدالقادر القط، محمود حسن اسماعیل، علی محمود طٰہٰ اور ابوالقاسم الشابی وغیرہ ہمارے سامنے روشنی میں آتے ہیں اور کچھ دیر کے لیے اپنی آب و تاب دکھا کر گزر جاتے ہیں اور ہم وقت کی گردش کے ساتھ بالآخر اس قریبی زمانے میں آ نکلتے ہیں جو گزشتہ پندرہ یا بیس برس سے شروع ہو کر اب تلک چلا جاتا ہے۔ اس زمانے میں ہم بالکل ہی دوسری طرح کی اور اچھوتی آوازیں سننے لگتے ہیں۔ یہ عبدالوہاب البیاتی، نزار قبانی، نازک الملائکہ اور محمود درویش جیسے شعرأ کی آوازیں ہیں — ایک نئے عہد کی شاعری، ایک جدید آہنگ اور اسلوب لیے ہوئے! جو ساری پچھلی شاعری سے نہ صرف موضوع و مضمون بلکہ ہیئت میں بھی مختلف ہے اور جس کے ساتھ عربی شاعری ایک ایسا موڑ مڑ چکی ہے کہ اس سے پہلے کی تمام شعری روایت موڑ کے اس طرف کی چیز بن کے رہ گئی ہے۔

گزشتہ ایک صدی کی عربی شاعری کے اس سرسری سے جائزے سے آپ یہ دیکھیں گے کہ جہاں ایک حوالے سے محمود سامی البارودی کی شاعری بلاشبہ 'جدید عربی شاعری' کہلائے جانے کے مستحق ہے وہاں ایک دوسرے ضمن میں بعد میں آنے والے مہاجر شعرا بھی 'جدید' نہیں کہلاتے، بلکہ دوسروں کے ساتھ ان کو بھی اب 'ماضیین' (گزرے ہوؤں) کے زمرے میں رکھا جاتا ہے — اس وجہ سے میں نے اس مجموعے کی نظموں کو جدید عربی شاعری کہنے کی بجائے زمانۂ حال کی عربی شاعری کہنا زیادہ مناسب سمجھا ہے۔ یہ اس زمانے کی شاعری ہے جس میں یہ سطور لکھی جا رہی ہیں۔ ان نظموں کی ایک بڑی تعداد ۱۹۷۰ء یا اس کے بعد کے عرصے میں لکھی گئی ہے اور ایک نظم (فدوی طوقان کی "ایک انوکھے دن میں وارداتِ قتل") اسی سال ۱۹۷۰ء کے اوائل میں شائع ہوئی ہے۔

آج کی عربی شاعری کے ان نمونوں میں پڑھنے والے کو ایک خاص ربط اور ہم آہنگی دکھائی دے گی، اور وہ یہ کہ یہ تقریباً سب کی سب نظمیں زیادہ تر راست اور کہیں کہیں بالواسطہ انداز میں اس مزاحمتی رویے کی نمائندگی کرتی ہیں جو عربوں نے صیہونیت کی تحریک کے خلاف گزشتہ پچیس تیس برس سے اختیار کر رکھا ہے۔ یہ رویہ آج عرب محبِ وطن کی سیاسی بیداری اور قومی غیرت کا عنوان ہے، اور اگرچہ وہ منزل جہاں وہ اپنے اس رویے کے سہارے پہنچنا چاہتا ہے، ابھی آنکھوں سے اوجھل ہی ہے اور اس کی راہ روز بروز دشوار ہوتی جاتی ہے تاہم وہ اپنی مزاحمت (Resistance) اور بغاوت میں آج بھی اسی طرح مخلص، پُرجوش اور ثابت قدم ہے جس طرح وہ پہلے دن تھا۔ صیہونیت کی اس تحریک نے عربوں کو صدیوں کی عافیت پسندی اور آسودہ خوابی سے جھنجھوڑ کر بیدار کیا ہے۔ وہ آنکھ ملتے ہوئے اُٹھے ہیں، لیکن افسوس کہ اُس وقت جب، ایک غاصب ان کی سرزمین میں اپنے پاؤں بہت گہرے جما چکا تھا، اور سیاسی اور اقتصادی سطح پر اس نے اپنے لیے دنیا کی بڑی طاقتوں کی پشت پناہی حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ بیس برس کے عرصہ میں عربوں نے تین مرتبہ اپنی قوت مجتمع کر کے صیہونی ریاست اسرائیل سے ٹکر لی، لیکن ہر دفعہ انھیں شکست کھا کر پسپا ہونا پڑا۔ اپنے مذہب کی برتری اور قوتِ ایمانی پر نازاں یہ عرب لوگ کبھی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے درمیان تین طرف سے گھری ہوئی ایک چھوٹی سی یہودی مملکت ان کے لیے ایک ناقابلِ تسخیر قلعہ ثابت ہوگی، اور ہر نئی جنگ کے بعد اُس کی سرحدیں پھیلتی چلی جائیں گی۔ حالات کے اس کٹھور پن نے عربوں کو شکستِ فریبِ نظر Disillusionment سے دوچار کیا ہے، اور انھیں زک اُٹھانے کے بعد اس حقیقت کا ادراک ہوا ہے کہ آج کی اس دنیا میں پنپنے اور اپنے ملک کو غاصبوں کی دست برد سے بچانے کے لیے محض مذہبی احساسِ برتری، نسلی تفاخر، جوششِ جذبات اور کثرتِ تعداد کافی نہیں۔ اس کے لیے کچھ دوسری طرح کے قومی خصائص اور تربیت و انضباط کی ضرورت ہوتی ہے، اور ان چیزوں میں ان کا حریف ان سے یقیناً

زیادہ مسلح ہے! — عربوں کی جو نسل آج شعور کی پختگی کو پہنچی ہوئی ہے وہ اپنی زندگی میں شکستِ سحر کی ان سب منازل سے گزر کر آئی ہے۔ اُس نے اوائل عمر میں اپنے بڑوں کے وہ پُر شور نعرے بھی سنے تھے کہ ہم اسرائیل کو اپنے قدموں تلے روند ڈالیں گے اور اسے صفحۂ ہستی سے مٹا کر دم لیں گے، اور پھر اپنی آنکھوں سے اس نے مہر کا یہ دوسرا رُخ بھی دیکھا کہ اسرائیل نے حملہ کر کے ہفتے کے دنوں سے بھی کم عرصے میں عربوں کی فوجی طاقت کو مفلوج کر کے رکھ دیا، ان کے کچھ اور علاقے اپنے قبضے میں کر لیے اور کچھ مزید فلسطینی عربوں کو اپنے گھر بار اور املاک چھوڑ کر مہاجر بننے اور در بدر ٹھوکریں کھانے پر مجبور کر دیا — اس وجہ سے آج کی عربی نسل ایک گھائل شخصیت کی نسل ہے۔ صہیونیت کے ہاتھوں اس کے قومی تشخص اور اس کی نسلی غیرت و حمیت کو ایسے کاری زخم لگے ہیں جو اب تک ہرے چلے آتے ہیں اور ان سے برابر خون رس رہا ہے۔ فلسطینی شاعر محمود درویش اپنی ایک تازہ نظم میں کہتا ہے:

یہ سمندر پھیلا ہے
بیچ آسمان کے اور میرے دہنِ زخم کے
اور میں ایک ایسے افق کی سمت چلا ہوں
جو ہم پر جھکا ہے
جو ہمارے لیے مصروفِ دعا ہے!

محمود علامات کا شاعر ہے۔ اس ٹکڑے میں سمندر، آسمان، افق وغیرہ الفاظ کی ایک سے زیادہ تعبیریں کی جا سکتی ہیں، لیکن دہنِ زخم کا اشارہ ایک ہی چیز کی طرف ہے، اور وہ ہے شاعر کا وطنِ مسلوب اور اس کا وہ المیہ جس کی ٹیسیں وہ اپنی روح میں محسوس کرتا ہے۔

صہیونیت کی تحریک سے کیا مراد ہے؟ اس کی نشو و نما کیسے ہوئی، اور پھر یہ فلسطین میں آ کر کیوں کر آکاس بیل کی طرح سارے علاقے پر پھیل گئی؟ اس بارے میں اپنی معلومات

تازہ کرنے کے لیے ہمیں تھوڑی دیر کے لیے تاریخ میں کچھ پیچھے تک جانا پڑے گا۔

صیہونیت کا لفظ صیہون Zion سے نکلا ہے جو شہر یروشلم کے نواح میں واقع دو پہاڑیوں میں سے ایک پہاڑی کا نام تھا۔ یہ پہاڑی زمانۂ قدیم سے اس مقام پر موجود تھی۔ پھر جب اس کے دامن میں یروشلم کا شہر آباد ہوا تو اس شہر کو دخترِ صیہون کہا جانے لگا۔ صیّون کا لفظ (جو عربی میں آکر صیہون ہوا) عہد نامۂ قدیم میں ڈیڑھ سو سے زائد مقامات پر آتا ہے۔
کتاب یسعیاہ میں ایک جگہ مذکور ہے:

"... بلکہ بہت سی امتیں آئیں گی اور کہیں گی آؤ خداوند کے پہاڑ پر چڑھیں، یعنی یعقوب کے خدا کے گھر میں داخل ہوں اور وہ اپنی راہیں ہم کو بتائے گا اور ہم اس کے راستوں پر چلیں گے۔ کیونکہ شریعت صیّون سے اور خداوند کا کلام یروشلم سے صادر ہوگا۔"

اسی طرح کتاب نوحہ میں یروشلم کی تباہی کے ضمن میں آتا ہے:

"صیّون کی راہیں ماتم کرتی ہیں کیونکہ عید کے لیے کوئی نہیں آتا... دخترِ صیّون کی سب شان و شوکت جاتی رہی... دشمنوں نے اسے دیکھ کر اس کی بربادی پر ہنسی اُڑائی۔ یروشلم سخت گناہ کر کے نجس ہو گیا۔"

انجیل میں صیّون کا ذکر جہاں جہاں اور جس طرح سے آتا ہے اُس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے کی مذہبی روایت میں صیّون اور یروشلم کو تقریباً وہی حیثیت حاصل تھی جو اسلام میں مکۂ مکرمہ اور اس کے نواحی مقامات منٰی اور عرفات وغیرہ کو حاصل ہوئی۔ یروشلم میں معبدِ سلیمان بھی تھا جو یہودیوں کے لیے مرکزی اور مقدس ترین عبادت گاہ تھی۔ فلسطین کا علاقہ اس زمانے میں سلطنتِ روما کے زیرِ اقتدار تھا، اور سلطنت کے دور افتادہ حصوں میں رومی اقتدار

کے خلاف جو بغاوتیں سر اٹھاتی رہتی تھیں ان میں یہودی بھی شامل ہونے لگے تھے۔ اُن کے اس رویے سے برافروختہ ہو کر سن ۷۰ بعدِ مسیح میں رومی فوجوں نے یروشلم پر چڑھائی کر دی، شہر کو تاخت و تاراج کیا اور معبدِ سلیمان کو جلا کر راکھ کر دیا۔ سن ۱۳۱ء میں قیصر ہیڈرین نے معبد کی تعمیرِ نو کا حکم دیا، لیکن انہی دنوں روم کے خلاف ایک اور بغاوت ہوئی اور یہودی اس میں بھی ملوث پائے گئے۔ اس پر ہیڈرین نے ان کا ہمیشہ کے لیے قلع قمع کرنے کی ٹھانی۔ اس نے باغیوں کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتارا، ان کے شہر کو مسمار کر کے ملبے کا ڈھیر بنا دیا، اور سب یہودیوں کو حکم دیا کہ یروشلم سے ہمیشہ کے لیے نکل جائیں اور آئندہ کبھی اس سرزمین کا رُخ نہ کریں ورنہ ان کا سر قلم کر دیا جائے گا۔ آگے چل کر انھیں صرف اس امر کی اجازت ملی کہ سال میں صرف ایک دن — ۹ اگست کو — یروشلم میں آ کر معبدِ سلیمان کی تباہی کی برسی منائیں اور ایک مقررہ رقم ادا کر کے معبد کی دیوار کے ساتھ لگ کر نوحہ و بکا کرنے کا حق حاصل کریں۔

یروشلم کی تباہی اور اپنی جلاوطنی کے بعد یہودی قوم یورپ کے مختلف حصوں میں بکھر کے رہ گئی۔ لیکن وہ جہاں کہیں بھی تھے، فلسطین میں واپس آنے کی آرزو ان کے ایمان کا جزو اور ان کی زندگیوں کا خواب بنی رہی۔ اسی خواہش کی تکمیل میں، اور محض مذہبی اغراض کی خاطر، بیسویں صدی کے اوائل میں کچھ یہودی لوگ فلسطین میں آ کر رہنے لگے۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے تک ایسے یہودیوں کی تعداد اسی ہزار سے زیادہ نہ تھی۔

انیسویں صدی کے آواخر سے 'صیہونیت' جو اس سے پہلے محض یروشلم واپس جانے تک ایک موہوم سی خواہش کا نام تھا، ایک باقاعدہ عالمی تحریک کی صورت اختیار کرتی ہے، اور اسے یہ شکل دینے میں اولیت ایک جرمن شوشلسٹ موسز ہیس[1] کو حاصل ہے۔ اس کے بعد لیو پنسکر[2] نے جو اوڈیسہ (یوکرین) کا ایک طبیب تھا، جرمن زبان میں مغربی یورپ کے یہودیوں

۱: Moses Hess (1812-75)

۲: Leo Pinsket (1822-91)

کے نام ایک اپیل شائع کی کہ بکھری ہوئی یہودی اُمت کو تباہی سے بچایا جائے۔ مغربی یورپ میں تو یہ اپیل کوئی بازگشت پیدا نہ کر سکی، لیکن روس میں "محبانِ صیہون" Houevei Zion کے نام سے ایک چھوٹا سا گروہ اس کے گرد اکٹھا ہو گیا۔ اس کے بعد اس تحریک کے سلسلے میں ایک اور اہم نام آشر گنز برگ[1] کا آتا ہے، جس نے 'یکے از مرداں' Ahad Haan کے قلمی نام سے صیہونیت کے تصور پر متعدد اہم مضامین لکھے۔ لیکن گنز برگ جیسا صیہونی رہنما اور مفکر بھی فلسطین کو یہودیوں کے لیے محض ایک ثقافتی مرکز بنانا چاہتا تھا اور اس امکان کا قطعی منکر تھا کہ فلسطین میں مقامی آبادی کو بے دخل کر کے اس میں یہودی اکثریت کو بسایا جا سکتا ہے۔

اس طرح سفر کرتے ہوئے یہ تحریک ایک آسٹرین صحافی تھیوڈور ہرزل[2] تک پہنچی، جس نے ۱۸۹۶ء میں "وطنِ یہود" Der Judenstadt کے عنوان سے ایک کتابچہ لکھا، اور پھر اگست ۱۸۹۷ء میں سوئٹزرلینڈ کے شہر بازل میں پہلی صیہونی کانگریس بلائی۔ ہرزل کے بعد تحریک کا مرکز برلن منتقل ہو گیا اور پہلی جنگ عظیم کے بعد یہ مرکز لندن آگیا، جہاں اس کی سربراہی ان روسی یہودیوں (کائم وائتسمن اور ناہوم سوکولوف[3]) کے ہاتھ میں آئی جو اس وقت وہاں مقیم تھے۔ صیہونیت نے اب ایک فعال عالمی تحریک کی صورت اختیار کر لی تھی جسے مالی امداد امریکہ کے یہودی مہیا کرنے لگے تھے اور جس کے لیے کارکن اور رضا کار پولینڈ اور دوسرے یورپی ملکوں میں منظم ہو رہے تھے۔

پہلی جنگِ عظیم کے زمانے سے یوں لگتا ہے جیسے تحریک صیہونیت کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچانے اور فلسطین میں یہودیوں کا وطن قائم کرنے کی ساری ذمہ داری حکومتِ برطانیہ

۱؎ Asher Ginzberg (1856-1927)

۲؎ Theodor Herzel

۳؎ Claim Weizmann, Nahum Sokolow

نے اپنے کندھوں پہ لے لی تھی۔ بیسویں صدی کے اس حصے کی تاریخ کا ایک بڑا حصہ ہم سب کے سامنے گزرا ہے، اس لیے اس عرصے کے واقعات کا استقصاء کرنے کی ضرورت نہیں ہو گی، تاہم یاددہانی کے طور پر چند اہم اور نمایاں واقعات کا تذکرہ کرنا فائدے سے خالی نہ ہوگا:

- ــــ انیسویں صدی میں اور پہلی جنگِ عظیم کے زمانے تک عرب علاقے سلطنتِ عثمانیہ کے زیرِ نگین تھے۔ جنگ عظیم کے خاتمے پر یہ اس سے کٹ کر الگ ہو گئے اور انھیں ریاستوں میں تقسیم کر کے انجمن اقوام کی نگرانی میں برطانیہ اور فرانس کے انتداب Mandate میں دے دیا گیا۔ برطانیہ کے حصے میں عراق، اردن اور فلسطین کی ریاستیں آئیں، اور فرانس کے حصے میں شام اور لبنان!
- ــــ ۱۹۱۷ء میں، جب کہ جنگ ابھی جاری تھی، برطانیہ کے وزیر خارجہ بالفور نے اعلان کیا کہ اس کی حکومت یہودیوں کے لیے فلسطین میں وطن قائم کرنے کی تائید کرتی ہے۔ چند سال بعد انجمن اقوام نے بھی صیہونی مقاصد کی حامی بھر لی، اور برطانیہ کے ذمے یہ فریضہ عائد ہوا کہ وہ اپنے انتداب کے پچیس برسوں (۱۹۲۳ء۔ ۱۹۴۸ء) میں اس منصوبے کو عملی جامہ پہنائے۔
- ــــ پہلی جنگ عظیم کے بعد کی دہائی میں یہودیوں کی فلسطین میں آمد کا سلسلہ جاری رہا، اور ہر سال تقریباً آٹھ ہزار یہودی اس ملک میں آکر آباد ہوتے رہے۔ لیکن جب جرمنی میں ہٹلر برسرِ اقتدار آیا تو اس تعداد میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ صرف ۱۹۳۵ء میں باسٹھ ہزار یہودی فلسطین میں آکر آباد ہوئے۔ فلسطینی عربوں نے یہودیوں کے یوں اُمنڈ کر آنے پر کافی احتجاج کیا۔ ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۶ء میں ملک میں بڑے پیمانے پر ہڑتالیں اور فسادات ہوئے، لیکن ان کا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ بڑی طاقتوں نے فلسطین کو تقسیم کرنے کی تجویز کی۔ لیکن یہ نہ عربوں

کو منظور ہوئی، نہ یہودیوں کو۔

• ——— ۱۹۴۷ء میں، جب کہ فلسطین میں برطانوی انتداب کا ایک سال باقی تھا، برطانیہ نے فلسطین کا مسئلہ اقوامِ متحدہ کے سپرد کر دینے کا اعلان کیا۔ اقوام متحدہ میں فلسطین کو تقسیم کر دینے کی تجویز پیش ہوئی، جس کی رو سے ملک کا دو تہائی حصہ یہودیوں کے سپرد کیا جانا تھا اور ایک تہائی حصہ ہمسایہ عرب ریاستوں میں ضم کیا جانا تھا۔ یہودیوں کے لیے یہ تقسیم قابلِ قبول تھی، لیکن عربوں نے اسے مسترد کر دیا۔

• ——— مئی ۱۹۴۸ء میں برطانوی انتداب کے اٹھتے ہی یہودیوں نے فلسطین میں اسرائیلی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا، جس کی حدود وہی تھیں جو اقوامِ متحدہ نے تجویز کی تھیں۔

• ——— اس کے معاً بعد ہمسایہ عرب ریاستوں نے اسرائیل پر حملہ کر دیا لیکن مقابلے میں شکست کھائی۔ فروری ۱۹۴۹ء میں جنگ بندی عمل میں آئی اور اسرائیل نے عربوں کے جو علاقے فتح کیے تھے۔ ان میں سے کچھ واپس کیے، لیکن کچھ اپنی مملکت میں شامل کر لیے ـــ اس جنگ کے نتیجے میں فلسطین کے دس لاکھ عرب باشندے گھر سے بے گھر ہو کر مہاجر بن گئے۔ اُن میں سے کچھ آج کویت میں ہیں کچھ لبنان میں اقوامِ متحدہ کے نصب کیے ہوئے مہاجر کیمپوں میں زندگی گزار رہے ہیں، اور کچھ لاطینی امریکہ میں جا بسے ہیں۔

• ——— ۱۹۵۶ء میں مصر، اردن اور شام نے ایک مشترکہ کمان قائم کر کے اسرائیل پر دباؤ ڈالنا شروع کیا اور جنوب میں خلیجِ عقبہ کو جانے والے اس کا تجارتی راستہ بند کر دیا۔ اسرائیل نے جوابی کارروائی کرتے ہوئے صحرائے سینا پر حملہ کیا اور پانچ دن میں اُسے فتح کر لیا۔ بعد میں بڑی طاقتوں کے دباؤ کے تحت اسرائیل

کو اپنے علاقے کو واپس جانا پڑا۔ اسی زمانے میں برطانیہ اور فرانس نے سویز پر حملہ کیا، لیکن جمال عبدالناصر نے جم کر مقابلہ کیا اور ان کے عزائم کامیاب نہ ہونے دیے۔

جون ۱۹۶۷ء کی چھ یومی جنگ میں اسرائیل نے ۱۹۵۶ء کا عمل دہرایا، اور مصر، اردن اور شام پر بیک وقت حملہ کر کے پانچ دن میں ایک طرف صحرائے سینا فتح کر لیا، اور دوسری طرف شہر یروشلم کا مسلم حصّہ بھی اپنے قبضے میں کیا، اور دریائے اردن کا مغربی کنارا اردن کی افواج سے خالی کرا لیا۔ اقوامِ متحدہ کے بیچ بچاؤ سے جنگ بندی عمل میں آئی، لیکن پورا صحرائے سینا اسرائیل کے قبضے میں چلا گیا۔

نومبر ۱۹۷۳ء میں چوتھی مرتبہ اسرائیل اور عرب ریاستوں کے درمیان ایک بڑی جنگ ہوئی، جس کے نتیجے میں مصر نے سویز کے مشرقی کنارے پر صحرائے سینا کا کچھ علاقہ واپس لے لیا اور دوسرے محاذوں پر بھی عرب افواج نے پہلے کی نسبت بہتر قوتِ مدافعت کا ثبوت دیا۔ اس جنگ کے حالات اور بعد کے واقعات زمانۂ حال کی چیزیں ہیں، اور ہم سب کے سامنے ہیں۔

صیہونیت کے ارتقاء اور عرب اسرائیل کشمکش کا یہ بیان اختصار کی کوشش کے باوجود قدرے طویل ہو گیا۔ لیکن قضیۂ فلسطین اور عربوں کے جذباتی اور ذہنی رویے پر اس کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے واقعات کے اس سارے سلسلے کو نگاہ میں رکھنا ضروری ہو گا۔ گذشتہ ربع صدی کی یہ تاریخ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس نے عربوں کی نئی نسل کے مزاج، ان کی سوچ کے انداز، ان کے ادب اور خصوصیت کے ساتھ ان کی شاعری کو بنیادی طور پر متاثر کیا ہے!

عربی شاعری میں فلسطین کا ذکر اس زمانے سے آنے لگا ہے جب جنگِ عظیم

اول کے دنوں میں بالفور کا اعلان منظرِ عام پر آیا تھا، اور جنگ کے ختم ہوتے ہی فلسطین میں یہودیوں کی آمد روزمرہ کا معمول بن گئی تھی۔ اس وقت کے سب مشہور شعراء مثلاً عبدالمحسن الکاظمی، رشید سلیم الخوری، محمد علی الحومانی، ابراہیم طوقان، امین ناصر الدین، بشارۃ الخوری، احمد محرّم اور علی الجارم نے فلسطین کی تشویش ناک صورتِ حال کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا تھا، اور بعض شعراء کے ہاں ان نظموں کی تعداد اتنی تھی کہ ان کے دیوانوں میں وہ "فلسطینیات" کے عنوان سے ایک علیحدہ باب کی صورت میں درج ہوتی تھیں۔ بالفور کے اعلان کے بارے میں رشید سلیم الخوری کا یہ شعر آج بھی لوگوں کو یاد ہوگا:

لو كنت من اهل المكارم لم تكن
من جيب غيرك محسناً يا بلفر

(اے بالفور! اگر تو باکردار لوگوں میں سے ہوتا تو دوسروں کی جیب کاٹ کر یوں نوازشیں نہ کرتا!)

اور علی الجارم نے وقت سے بہت پہلے اپنی شاعرانہ بصیرت سے یہ دیکھا کہ فلسطین میں اندلس کی تاریخ اپنے آپ کو دہرانے لگی ہے، چنانچہ اس نے اہلِ فلسطین کو باہم متحدہ رہنے کی تلقین کی اور انھیں مغرب کی ریشہ دوانیوں سے خبردار کرتے ہوئے کہا کہ شاخِ گل کے سائے میں بعض اوقات افعی بھی چھپا ہوتا ہے:

لقد اعاد بها التاريخ اندلساً
اخرى و طاف بها للشر طوفان
بنى فلسطين كونوا امة ويداً
قد يختفى فى ظلال الورد ثعبان

آگے چل کر جب اسرائیل کی مملکت وجود میں آئی اور اس نے ۱۹۴۹ء میں پہلی بار عرب ریاستوں کو میدانِ جنگ میں نیچا دکھایا تو اس کا ایک شدید اور ہمہ گیر ردِعمل عرب عوام میں یہ ہوا کہ اُن کا اعتماد اپنے اس وقت کے سربراہانِ مملکت اور ان کے نظامِ ملکی Organization سے اُٹھ گیا۔ مصر میں شاہ فاروق کی معزولی اور جمال عبدالناصر کا ظہور اسی بے اعتمادی اور اس سے پیدا ہونے والے جذبۂ بغاوت کا نتیجہ تھا۔ جولائی ۱۹۵۲ء میں واقع ہونے والے اس فوجی انقلاب نے نہ صرف مصر میں، بلکہ تمام عرب دنیا میں انقلاب کا ولولہ پیدا کر دیا، اور سیاست کے علاوہ ادب اور فکر کے میدانوں میں بھی ’الثورۃ‘ ’الثورۃ‘ (انقلاب) کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ’’الادب الثوری‘‘ اس ادب کو کہا جانے لگا جو اپنے اندر انقلابی روح رکھتا ہو، جو حالتِ موجودہ میں تغیر لانا چاہتا ہو! — اور یہ سارا انقلاب اور یہ جذبۂ بغاوت صرف بیرونی غاصب کے مقابلے میں ہی نہیں تھا، بلکہ اس کا ہدف، اتنی ہی شدت کے ساتھ، خود عرضوں کے اندر کے کاہل، رجعت پسند اور تخریبی عناصر بھی تھے!

شاعر چونکہ اپنے معاشرے کا سب سے حساس فرد ہوتا ہے، فلسطین کی اس دل خراش صورتِ حال سے عرب شعراء نے بہت گہرا اثر لیا۔ نتیجۃً عربی شاعری کا مزاج اور موضوعات بدلنے لگے۔ ایسے شعراء جو پہلے اپنی ذات کے ساحل کی تلاش میں وقت کے دھارے پر حیران اور خاموش بہتے چلے جاتے تھے، اور زندگی کے بارے میں جن کا نقطۂ نظر کہیں رومانی ہوتا تھا اور کہیں مثالی، اب حقائق کی زمین پر اتر آئے اور ’ماساۃ‘ (المیے) کی شاعری کرنے لگے۔ اس المیے سے سب سے زیادہ اور براہِ راست متاثر ہونے والے خود فلسطینی شعراء تھے جو جنگ اور قتل و غارت گری کے جہنم سے گزرے تھے اور جنھوں نے اپنے عزیزوں اور ہموطنوں کو گھر بار اور کھیتوں سے بے دخل ہو کر اس قافلے میں شامل ہوتے دیکھا تھا جس کے سامنے کوئی منزل نہیں تھی اور جسے بالآخر مہاجر کیمپوں میں جا کر ایک طویل اور غیر متعین عرصے کے لیے مقیم ہونا تھا۔ چنانچہ ان کی شاعری پر اس تبدیلی کا عمل زیادہ فوری اور زیادہ واضح

دکھائی دیتا ہے ۔مثال کے طور پر فلسطین کا ابو سلمیٰ 'ماساۃ' سے پہلے وجدانی شاعر تھا جسے ہر خوب صورت چیز سے عشق تھا، جو حسن کی پرستش کرتا تھا، اور اپنے شعروں میں چاند اور درختوں اور پھولوں سے ہم کلام ہوتا تھا، لیکن المیے کے بعد وہ ملتزم (پابندِ مقصد) شاعری کرنے لگا، اور اس کی زمین ــــــ فلسطین ــــــ ہی اس کے جذبے اور خیال کا مرکز بن کر رہ گئی ۔اس کے تازہ دیوان کا نام ہے 'من فلسطین ریشتی' (میرے بال و پر فلسطین سے نکلے ہیں) اور اس کا جو دیباچہ آج کے نوجوان شاعر محمود درویش نے لکھا ہے اس کا عنوان ہی یہ ہے کہ:

انت الجذع الذی نبتت علیه اغانینا ۔

(تو وہ شاخ ہے جس سے ہمارے نغموں کے شگوفے پھوٹے ہیں).

یہی حال فلسطینی شاعرہ فدویٰ طوقان کا ہے، جو پہلے اپنے اندر کی خواب ناک دنیا میں کھوئی رہتی تھیں؛ کبھی اپنے جذبات کو بے لگام کرتی ہوئی اور کبھی اپنے وجود کے اندر اُتر کر اپنے آپ کا کھوج لگاتی ہوئی! وہ ہمیشہ سے رومان اور عشق کی شاعرہ مشہور تھیں اور ان کے پہلے تین دیوانوں کا بنیادی موضوع ہی 'محبت' تھا۔ لیکن جو کچھ ان کی آنکھوں نے اپنے اُجڑے اور لٹے ہوئے دیار میں دیکھا اس نے انہیں مجبور کیا کہ وہ کچھ دیر کے لیے معاملاتِ دل کو ایک طرف رکھ کر حقیقت اور واقعے کی بات کریں:

اوپر اُٹھتے اور لہراتے ہوئے دھوئیں میں سے میں نے جھانکا، تو وہ حویلی اجاڑ اور ویران
پڑی تھی اور اس کی دہلیز پر کیڑوں اور چیونٹیوں کے قافلے رواں تھے
آہ! وہ کٹے ہوئے ہاتھ اور بازو، جو راہوں میں بکھرے تھے، اور وہ دیدوں کے
منکے مٹی میں رُلتے ہوئے!

اور چہرے جو مٹی میں مل کر اور زیادہ مٹیالے ہو گئے تھے!

لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت سے بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ اس پہلی شکست کے بعد 'ماساۃ' کے زیرِ اثر ہونے والی ساری شاعری فن کا اعلیٰ معیار پیش نہیں کرتی

تھی، بلکہ اس کی ایک بڑی اکثریت میں سطحی جذباتیت، میلو ڈراما، صحافتی انداز کا جوش و خروش اور ان ساری چیزوں کے پیچھے ایک بے حد مایوس اور ماتمی لہجہ دیکھنے میں آتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ صدمہ بالکل تازہ اور براہِ راست تھا۔ وہ ابھی شاعر کی ذات میں گہرا اتر کر رچا بسا نہیں تھا۔ اس کا نفسیاتی تجربہ نہیں بنا تھا کہ شاعر اس کے بارے میں جو کچھ بھی کہتا اس میں ایک عمیق احساس اور فنی پختگی پائی جاتی۔ ایک دوسری وجہ اس صورت حال کی یہ بھی ہو سکتی ہے کہ فلسطین کا مسئلہ ان ابتدائی برسوں میں ایک غیر متعین اور سیال Fluid حالت میں تھا۔ شاعر کو کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ آگے چل کر کیا کیا ہونے والا ہے، اس لیے اس مسئلے کی بابت وہ ابھی تحیّر اور کشمش و پیچ کی حالت میں تھا۔ اس زمانے کی شاعری کوئی شک نہیں کہ بناوٹ اور آرائش سے پاک، خلوص اور سچائی کی شاعری ہے، لیکن اس میں گہرائی نہیں ہے، وسعتِ نظر نہیں ہے، تصوّر و خیال کی اُپج نہیں ہے، وہ پختگی اور رچاؤ نہیں ہے جو کسی تجربے کے شاعر کی ذات میں پوری طرح جانب ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ فلسطین مہاجروں کی حالت زار کا بھی نقش آنکھ یا کان کی راہ سے شاعر کے ذہن پر مرتسم ہوتا تھا، وہ اُسے ہو بہو شعر کی صورت میں موزوں کر دیتا۔ اس ضمن میں مثلاً عراق کے شاعر ابراہیم الوائلی کی کھینچی ہوئی یہ تصویر بہت دکھ بھری اور المناک دکھائی دے گی:

> اور ایک طفلِ شیر خوار جب بھوک سے بلبلاتا ہے تو آنسوؤں کے قطرے
> اس کی غذا بنتے ہیں۔
>
> سینۂ مادر کو جب وہ اپنے ہاتھوں سے نچوڑتا ہے تو اس سے بجائے
> دودھ کے خون کی دھار بہہ نکلتی ہے۔

لیکن یہ حالات کی ایک بیانیہ منظر کشی ہے، ایک کیمرے کی تصویر، جس میں شاعر کے فکر و خیال کا عنصر دکھائی نہیں دیتا۔

تقریبًا اسی زمانے میں شاعری میں ایک بڑے انقلاب کی ابتدا ہوئی۔ یہ "الشعر الحُر" (آزاد شاعری) کے وہ نئے تجربات تھے جو صفِ اول کے چند ایک شعراء (عراق کی نازک الملائکہ اور بدر شاکر السیاب) نے کیے اور جنھوں نے عربی شاعری میں اظہار کے امکانات کی ایک نئی دنیا کا دروازہ کھول دیا۔ اس وقت یہ کہنا تو شاید مشکل ہو کہ یہ تجربات محض مغربی شاعری کی جدتوں سے متاثر ہو کر کیے گئے تھے، یا شاعروں نے بدلی ہوئی قومی اور سماجی صورتِ حال میں اپنے دل کی بات کھل کر کہنے کے لیے "الشعر العمودی" یا "الشعر المقفی" (پابند شاعری) کو مناسب حال نہ پایا تھا، اور ایک قدرتی اور بے محابا جذباتی کیفیت کے ساتھ اپنے قارئین تک پہنچنے کے لیے انھوں نے آزاد شاعری کا راستہ اختیار کیا تھا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ شاعری کی اس نئی ہیئت نے بغاوت اور انقلاب کی اس تحریک کو ایک دلچسپ اور مؤثر ذریعۂ اظہار مہیا کر دیا جس کا اس وقت ہر طرف چرچا تھا، اور رفتہ رفتہ آزاد شاعری "الثورۃ" (انقلاب) کی لسان ناطق بن گئی، اور روایت پسند نقادوں کے احتجاج اور انکار اور تمسخر کے باوجود اس کی مقبولیت اور رواج میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس زمانے کے شاعروں کی ایسی نسل نے، جو عمر میں کچھ بڑی اور تجربہ کار تھی، آزاد شاعری کو بڑی رغبت سے اپنایا اور کچھ عرصے تک دونوں طرح کی (یعنی پابند اور آزاد) شاعری کرنے کے بعد بالآخر روایتی شاعری کو خیر آباد کہا اور اس نئی انقلابی شاعری کے ہو رہے۔ ۱۹۵۵ء میں بیروت کے ممتاز ادبی مجلے "الآداب" نے الشعر الحدیث (جدید شاعری) کے عنوان سے جب اپنا ایک خاص نمبر نکالا، تو اس میں آزاد شاعری کا ایک پلہ مقفی شاعری کے مقابلے میں واضح طور پر بھاری تھا اور دیکھنے والوں نے دیکھ لیا تھا کہ مستقبل میں شاعری کی کون سی ہیئت زندہ رہنے اور پنپنے والی ہے۔

ایک طرف آزاد شاعری نے اظہار کے امکانات کو بے حساب وسعت دی اور اسالیبِ سخن کی نئی نئی راہیں شعراء کو سُجھائیں، اور دوسری طرف عرب شعراء کی وہ نسل، جو ۱۹۴۰ء

کے لیتے کے وقت ابھی ناتجربہ کار یا رومانی اور غیر ذمّے دار تھی، حالات اور تجربات کی آنچ سے گزر کر ایک حساس، باشعور اور پختہ فکر نسل کی حیثیت سے سامنے آئی۔ اور اظہار کے اس نئے وسیلے سے پوری طرح کام لیتے ہوئے اس نے سستی جذباتیت، نعرہ بازی، میلو ڈراما، اور رومان میں بھیگی ہوئی یاسیت سے بہت بلند ہو کر ایسی شاعری کی جس میں واقعیت پسندی تھی، خود احتسابی تھی، حقائق کا سامنا کرنے اور انہیں قبول کرنے کا حوصلہ تھا، قومی مسائل میں اپنی بے مائیگی اور زیادہ کچھ نہ کر سکنے کا افسوس تھا۔ ۱۹۵۵ء کے بعد دس پندرہ برس کی اس نئی عربی شاعری میں فنی خوب صورتی اور توانائی کے ساتھ ساتھ بیانِ واقعہ کی وہ صداقت بھی پائی جاتی ہے جو عربوں کی قومی زندگی کے کسی دوسرے پلیٹ فارم سے شاذ و نادر ہی سنائی دے گی۔ جون ۱۹۶۷ء میں عربوں کو اسرائیل کے مقابلے میں جو شکست اٹھانی پڑی وہ بڑی حوصلہ شکن تھی۔ جون کو عربی تقویم میں حزیران کہتے ہیں۔ چنانچہ اس شکست کے بعد شاعروں نے حزیران کو اپنی نکبت و ہزیمت کی علامت بنایا اور اس کے حوالے سے بہت کچھ کہا۔ اور اس طرح کا اعتراف اپنے بارے میں ایک شاعر ہی کر سکتا تھا کہ :

ہم نژادِ زیاں ہیں، فرومایہ اور رائیگاں موت کی نسل ہیں
مشرقی قہوہ خانوں کی سیلن میں ہم اپنی بے کار بحثوں کے ہاتھوں مرے
آہ اے جون کے آفتابِ گراں!
تو نے کیوں ہم کو دنیا کی ہر آنکھ پر یوں برہنہ کیا
کیوں سگانِ گرسنہ کی خاطر ہمیں بے کفن سرد لاشوں میں چھوڑ گیا
ہمارا وطن ایک مصلوب ہے اور چاروں طرف
آبرو کی بکھرتی ہوئی راکھ ہے!

شاعروں کی اس بڑی عمر کی، پختہ کار اور باتجربہ نسل کے نمائندوں میں عبدالوہاب

البیاتی (عراق)، نزار قبانی (شام) نازک الملائکہ (عراق) اور فدوی طوقان (فلسطین) کے نام بہت نمایاں ہیں۔ یہ وہ شاعر ہیں جنھوں نے اپنے عہد کا آغاز داخلیت، وجدانیت اور لذتیت سے کیا تھا، لیکن آگے چل کر وہ واقعیت اور مقصدیت کے ہو کر رہ گئے۔ ان میں سے ہر ایک شاعر کے کئی کئی دیوان شائع ہو چکے ہیں[1]۔ اور ان کی شاعری کے مختلف مراحل اور موڑ ان کے کلام کے ان مجموعوں میں بآسانی دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کے بعد جوان تر شعرا کی ایک نسل آتی ہے جن میں فن کے اعتبار سے سب سے ممتاز اور پیش پیش محمود درویش اور سمیح القاسم ہیں۔ یہ دونوں فلسطین کے اس علاقے سے تعلق رکھتے ہیں جو اب اسرائیل کے قبضے میں ہے چنانچہ انھوں نے اسرائیل میں رہ کر بہت مشقت، اذیت اور پابندی کی زندگی گزاری ہے، اور روز و شب کے ان تجربوں سے ہی اپنا شعری اسلوب پیدا کیا ہے، اور ایسی صورتِ حال میں جب کہ شاعر کو کھل کر اظہار کرنے کی آزادی نہ ہو، اور سر پہ ہر وقت احتساب اور سنسر کی تلوار لٹک رہی ہو، شاعر کے لیے علامتی اور مبہم اندازِ بیان اختیار کرنا صرف اس کے فنی مزاج کا تقاضا ہی نہیں بلکہ وقت کی ضرورت بھی بن جاتا ہے۔ یہ بات ہمیں محمود درویش کی شاعری میں زیادہ نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ محمود درویش نے علامتوں کے استعمال سے اپنی شاعری کو جو وسعت اور گہرائی دی ہے اس میں آج اس کا کوئی حریف نظر نہیں آتا۔ اور یہاں شاید اس امر کا ذکر نامناسب نہ ہو کہ محمود درویش شاعری میں افرو ایشیائی ادبی تنظیم کی طرف سے لوٹس Lotus انعام بھی حاصل کر چکا ہے۔

زیرِ نظر مجموعے میں مذکورہ بالا صرف چھ شعراء کا کلام شامل ہے یہ سب کے سب

---

[1]: ان میں سے صرف نزار قبانی کے آٹھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں، اور اس کے بعض مجموعوں کے پانچ پانچ اور چھ چھ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ عبدالوہاب البیاتی کے مجموعوں کی تعداد گیارہ ہے، اور محمود درویش کی سات!

اس وقت کی عربی شاعری کے افق کے درخشاں ترین ستارے ہیں۔ لیکن تقریباً اتنی ہی تعداد، اتنے ہی اہم شعرا کی ایسی ہے جن کی نمائندگی اس مجموعے میں نہیں ہو سکی۔ ایسے لوگوں میں خصوصیت کے ساتھ بدر شاکر السیاب (عراق) سلیمان العیسی (شام) صلاح عبدالصبور (مصر) خلیل حاوی (لبنان) احمد عبدالمعطی حجازی (مصر) اور معین بسیسو (فلسطین) کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مجموعے کا انتخاب کسی باضابطہ طریقے یا سوچے سمجھے ہوئے منصوبے کے تحت نہیں ہوا۔ ایک باضابطہ انتخاب کے لیے یہ ضروری تھا کہ ان تمام شعرا کے مجموعے یا ان کا بیش تر کلام ہمارے سامنے ہوتا (بہت دور کا امکان! اس لیے کہ پاکستان میں عربی ادب کی کتابیں ابھی تک جنسِ نایاب ہیں) اور اس میں سے ہر شاعر کی اہم ترین اور نمائندہ نظمیں منتخب کی جاتیں۔ اس کے برخلاف زیرِ نظر انتخاب کا ماخذ صرف ایک ادبی ماہنامہ۔ بیروت کا "الآداب" ہے جو میرے پاس گزشتہ آٹھ دس برس سے آ رہا ہے، اور اسی میں سے اپنی پسند کے مطابق یہ چند نظمیں لی گئی ہیں۔ اب "الآداب" میں ضروری نہیں کہ سبھی بڑے شاعر چھپتے ہوں، اور جن شعرا کا کلام اس میں چھپتا ہے وہ بھی ضروری نہیں کہ اُن کے فن کا بہترین نمونہ ہو۔ چنانچہ اس اعتبار سے زیرِ نظر انتخاب کو آج کی عربی شاعری کی پوری نمائندگی کا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ لیکن آج کی شاعری کا جو لحن اور اول الذکر چھ شعرا کے کلام میں ملتا ہے، وہ اس اعتبار سے ضرور نمائندہ ہے کہ اس کی بدولت ہم فلسطین کی صورتحال کے ضمن میں عراق، شام اور فلسطین کے چند بہترین شعراء کی حساسیت Sensibility اور طرزِ فکر و ادراک سے ایک بڑی حد تک آگاہی حاصل کرتے ہیں، اور ان نظموں کے مصرعوں میں ہم آج کے عرب شاعر کے دل کی دھڑکنیں واضح طور پر سن سکتے ہیں۔

عربی شاعری کے ان ترجموں کا سلسلہ کیوں کر شروع ہوا؟ اس کی بابت مجھے جو کچھ یاد ہے وہ یہ ہے کہ بیروت کے "الآداب" میں جب میں نے اس مجموعے کی پہلی نظم: عبدالوہاب

البیاتی کی " بکاء الی شمس حزیران " (آفتابِ جون کی نذر - ایک نوحہ) پڑھی تو اس نے مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کیا، اور میں نے اس کا اردو نثر میں ترجمہ کر کے امجد اسلام امجد کو دیا، جس نے اس بارے میں غالباً مجھ سے کوئی تقاضا بھی کر رکھا تھا۔ بیاتی کے اس نوحے نے شاعر امجد کے دل کے تار بھی ہلائے، اور اس نے اسے ایک دو روز کے اندر ہی اردو نظم میں ڈھال لیا۔ ایک ایسی نظم جس کا لب ولہجہ اور مزاج Mood یہاں کی عام نظموں سے بالکل مختلف، اور اس لیے اپنے اندر ایک نیا پن اور تازگی لیے ہوئے تھا۔ میں نے امجد کی اس نظم کو ایک تنقیدی نظر سے دیکھا، یہ جاننے کے لیے کہ ترجمے کے عمل سے گزر کر بیاتی کی حساسیت نے کتنا کچھ کھویا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے ایک خوش گوار حیرت ہوئی کہ اردو میں آکر بھی بیاتی بیاتی ہی رہا اور جو بات اس نے بکائیۃ میں کہنی چاہی تھی وہ نوحے میں بھی اسی شدت، اسی گہرائی، اسی حسرت اور درد کے ساتھ موجود تھی۔ یہ اردو نظم روزنامہ " امروز " میں شائع ہوئی اور شعراء اور قارئین نے اسے پسند کیا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ ایک دھیمی رفتار کے ساتھ چلتا رہا۔ مجھے جب کبھی اور فرصت ملتی مَیں ایک عربی نظم کا نثر میں ترجمہ کر کے لے آتا اور امجد کے حوالے کر دیتا، اور دو یا چار روز بعد جب امجد سے ملاقات ہوتی تو اس کے پاس اس کا منظوم ترجمہ سنانے کو موجود ہوتا، اور ہم اسے پڑھ کر اس پر تبادلۂ خیال کرتے۔ یہ ترجمے بعد میں ماہنامہ " فنون " یا کسی دوسرے اخبار یا رسالے میں چھپ جاتے۔ اس وقت تک ہم میں سے کسی کے دل میں یہ خیال نہیں تھا کہ آگے چل کر ان منظوم ترجموں کو کتابی صورت میں اکٹھا کیا جائے گا۔ لیکن لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس کے انعقاد اور اس کے بعد سے اہلِ پاکستان نے جس طرح سے مسئلہ فلسطین کے بارے میں زیادہ ہمدردی اور دل سوزی کے ساتھ سوچنا شروع کیا ہے، اس کے پیشِ نظر یہ مناسب معلوم ہوا کہ عربی نظموں کے ان اردو تراجم کو قارئین کی سہولت اور وسیع تر افادے کے لیے ایک کتابچے میں جمع کر دیا جائے۔

شاعری کے بارے میں یہ کلیہ اپنی جگہ برحق ہے کہ اس کا ترجمہ کسی دوسری زبان کی شاعری

ہیں نہیں ہو سکتا، اور اگر ایسا کیا بھی جائے تو شاعر کے پیغام کی وہ تمام باریکیاں، وہ فن کارانہ اشارے اور وہ جادوئی عنصر، جو اصل زبان میں موجود ہوتا ہے، دوسری زبان میں منتقل نہیں ہو پاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی زبان میں ایک خاص لفظ اپنے اندر معانی و مفاہیم کے جو متعدد پہلو، جو رنگ اور پرچھائیاں اور جو صوتی آہنگ رکھتا ہے، وہ ضروری نہیں کہ دوسری زبان کے اس لفظ میں یہ تمام و کمال موجود ہوں جو ترجمے میں اس کی جگہ پر لایا گیا ہے، اور جب ایسا ہو تو ترجمے میں مصرعے کی آب وہ نہیں رہتی جو اصل میں ہوتی ہے۔ اس کا مزاج کچھ اور ہو جاتا ہے، اس کی موسیقی بدل جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی ادب کی تاریخ میں ایک زبان کی شاعری سے دوسری زبان کی شاعری میں عمدہ اور فن کارانہ ترجموں کی تعداد اتنی کم ہے کہ انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ لیکن ایسے ترجمے بہر حال موجود ہیں اور ہم انہیں ہمیشہ سے پڑھتے چلے آرہے ہیں! — اس وقت دنیا کی مختلف زبانوں میں آزاد شاعری کی جو روش چل نکلی ہے اس نے مذکورہ بالا سلسلے میں کچھ ڈھیل کی گنجائش پیدا کر دی ہے اور قافیہ اور ردیف کی پابندیوں سے آزاد ہو کر ایک شاعر کے لیے یہ پہلے کی نسبت زیادہ ممکن اور قابلِ عمل ہو گیا ہے کہ وہ کسی اجنبی زبان کی شاعری کا ترجمہ کرتے وقت اصل کے اتنا قریب رہے جتنا کہ فن کے تقاضوں کو نبھاتے ہوئے ممکن ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ امجد اسلام امجد کی یہ کوشش محض یہ کہہ کر رد نہیں کی سکتی کہ ان ترجموں میں قاری کو جو آواز سنائی دیتی ہے وہ امجد ہی کی آواز ہوگی، بیاتی یا نزار قبانی یا سمیع القاسم کی آواز نہیں ہو سکتی۔ میں عربی اور اردو دونوں طرف کی نظموں کو سامنے رکھ کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ امجد نے اردو نظم میں ہر جگہ اصل شاعر کی جذباتی کیفیت اور مزاج اور احساس اپنے اوپر طاری کیا ہے اور اس میں اپنے مزاج اور طرزِ احساس کو کہیں مخل نہیں ہونے دیا۔ چنانچہ جذباتی اور احساسی کیفیت دونوں زبانوں میں ایک ہی ہے، لیکن اس کے اظہار کے لیے الفاظ کی پابندی نہیں کرتے۔ کہیں کوئی لفظ یا ٹکڑا زائد لانا پڑتا ہے، کہیں کوئی لفظ حذف کرنا پڑتا ہے، تاکہ ترجمے میں شاعر کا موڈ اپنی اصل صورت میں

برقرار رہے۔ شاعری کے ایک مترجم کے سامنے جب بھی یہ اختیار Option آئے گا کہ وہ یا تو اصل کے مفہوم و مدعا کا حق ادا کرے اور اس کی خاطر الفاظ اور جملوں میں ضروری ردّ و بدل روا رکھے اور اصل شاعر کی بات کے ابلاغ کو لفظوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔ تو ایک ذہین اور فن کار مترجم ہمیشہ پہلی صورت کو ترجیح دے گا اور اسی کو اختیار کرے گا — یہی میرے دوست امجد اسلام امجدؔ نے اپنے ان منظوم ترجموں میں کیا ہے!!

آخر میں ایک بات کی وضاحت کر دینا ضروری ہے، اور وہ یہ کہ امجد کی ان نظموں کی بنیاد ان نثری ترجموں پر ہے جو میں نے ان عربی نظموں کے کر کے اسے دیے تھے۔ اس لیے جہاں تک معنی و مدّعا کا تعلق ہے، امجد کی ان نظموں میں اگر کوئی چیز غلط یا اصل سے متضاد پائی جائے تو اس کی ساری ذمّہ داری مجھ پر ہوگی اور میں اس کے لیے جواب دہ ہوں۔ مجھے خوشی ہوگی اگر اس کتاب کے قارئین میں سے وہ اصحاب، جو عربی زبان سے شغل رکھتے ہوں۔ ان ترجموں میں اس قسم کی فروگزاشتوں کی نشان دہی کریں گے، تاکہ اگر ضروری ہو تو آئندہ ایڈیشن میں ان کا ازالہ کر دیا جائے۔

عکس

- عبدالوہاب البیاتی
- نزار قبّانی
- نازک الملائکہ
- محمود درویش
- سمیح القاسم
- فدویٰ طوقان

عبدالوهاب البیاتی

بکائیة الی شمس حزیران

طحنتنا فی مقاهی الشرق حرب الکلمات
و السیوف الخشبیة
والاکاذیب و فرسان الهواء
نحن لم نقتل بعیرا او قطاة
لم نجرب لعبة الموت و لم نلعب مع الفرسان
او نرهن الی الموت جواد
نحن لم نجعل من الجرح دواة
و من الحبر دما فوق حصاة
شغلتنا الترهات
فقتلنا بعضنا بعضاً و ها نحن فتات

فی مقاهی الشرق نصطاد الذباب
ترتدی اقنعة الاحیاء فی مزبلة التاریخ ،
اشباه رجال

لم نعلق جرسا فی ذیل هر او حمار
او نقل للاعور الدجّال :
لم لذت باذيال الفرار ؟

نحن جيل الموت بالمجان ، جيل الصدقات
هزمتنا فی مقاهی الشرق حرب الكلمات
و الطواويس التی تختال فی ساحات موت الكبرياء
و مقالات الذيول الادعياء
آه ، لطخ هذه الصفحة ، هذا الخبر الكاذب
يا سارق قوت الفقراء
حذاء الامراء
بدم الصدق ، و مت مثل فقاعات الهواء
لم نعد نقوى علی لعق الاكاذيب و تحبير الهراء
و اجترار الترّهات

نحن جيل الموت بالمجان ، جيل الصدقات
لم نمت يوما ، و لم نولد ، و لم نعرف عذاب الشهداء
فلماذا تركونا فی العراء
يا الهی ، للطيور الجارحات
نرتدی اسمال موتانا ، و نبكی فی حياء

آه ، لم تترك على عورتنا ، شمس حزيران رداء
و لماذا تركونا للكلاب ؟
جيفا دون صلاة
حاسلين الوطن المصلوب فى كف ، و فى الاخرى التراب
آه ، لاتطرد عن الجرح الذباب
فجراحى فم ايوب ، و آلامى الانتظار
و دم يطلب ثار
يا اله الكادحين الفقراء
نحن لم نهزم ، و لكن الطواويس الكبار
هزسواهم وحدهم ، من قبل ان ينفخ ديّار بنار !

* * *

عبدالوہاب البیاتی

آفتابِ جون کی نذر — ایک نوحہ

مشرقی قہوہ خانوں کی سیلن میں ہم اپنی بے کار بحثوں کے ہاتھوں مرے
جھوٹ کے چوبی ہتھیار سچ کے
ہواؤں کے گھوڑوں پہ لڑتے رہے!
موت کے شغل سے ہم شناسا نہیں
ایسے گھوڑے کے مالک ہیں جو آج تک
وادیٔ موت کی سمت دوڑا نہیں
شہسواروں کے پہلو میں ٹھہرا نہیں
وہ شکاری ہیں جس نے درندے تو کیا
اک پرندہ بھی ہاتھوں سے مارا نہیں
ہم نے زخموں سے اپنے قلم کے لیے روشنائی نہ لی
روشنائی کو ارضِ وطن پر بہے
خون کے سرخ دریا سے بدلا نہیں
ہم زیاں کار تھے، ایک دوجے سے لڑتے ہوئے کٹ مرے اور ٹکڑے ہوئے!

مشرقی قہوہ خانوں کی سیلن میں بیٹھے ہوئے آج ہم
مکھیوں کو پکڑنے کی بے کار دھن میں گرفتار ہیں
اور تاریخ کے سرد ملبے میں ہم ایسی پرچھائیاں ہیں
جو مردوں کے بہروپ میں گامزن ہیں
ہم پریشان ذہنوں کا ایک خواب ہیں
جس کی تعبیر سے کوئی واقف نہیں

ہم نژادِ زیاں ہیں، فرومایہ اور رائیگاں موت کی نسل ہیں
مشرقی قہوہ خانوں کی سیلن میں ہم اپنی بے کار بحثوں کے ہاتھوں مرے
ہم کو مارا ہمارے امیروں نے، جو آبرو کے جنازے میں شامل ہوئے
اپنے عشق کدوں میں چمکتے رہے!
اور ان کے حلیفوں کی بازی گری نے
اور ان کی خوشامد پہ پلتے ہوئے ان سگانِ کہن نے
جو لفظوں کا سینہ فریب اور دھوکے سے بھرتے رہے
اے غریبوں کے دشمن، امیروں کے ٹکڑوں پہ پلتے ہوئے
اب خدا کے لیے — جھوٹ کی داستان بند کر
اب ہماری نگاہیں ترے کذب کی اس فضول اور لمبی کہانی سے اُکتا گئی ہیں۔
ہمارے لیے تیرے لفظوں کی تفہیم ممکن نہیں
اب برائے خدا ان کو سچ کے لہو رنگ دریا میں دھو!
بلبلے کی طرح جی، مگر جھوٹ سے باز آ

ہم نژادِ زیاں ہیں، فرومایہ اور رائیگاں موت کی نسل ہیں
ہم نہ مرنے کے لمحے سے گزرے کبھی اور نہ پیدا ہوئے
اور نہ ہم کو پتا ہے شہیدوں کی بے نام تکلیف کا
ہم گِدھوں اور چیلوں کی خوراک ہیں — اے خدا!
ہم کو کیوں اس طرح دشتِ بے آب میں لا کے مارا گیا
کیوں ہمارے لیے شرم لکھّی گئی؟
کیوں ہمیں مرنے والوں کی لاشوں میں زندہ بدن دے کے رکھّا گیا؟
آہ اے جون کے آفتابِ گراں!
تو نے کیوں ہم کو دنیا کی ہر آنکھ پر یوں برہنہ کیا
کیوں سگانِ گُرسنہ کی خاطر ہمیں بے کفن، سرد لاشوں میں چھوڑا گیا
ہمارا وطن ایک مصلوب ہے اور چاروں طرف آبرو کی بکھرتی ہوئی راکھ ہے۔
میرے ہر زخم پر مکھیاں بھنبھناتی ہیں، ان کو عزیزو! اڑاؤ نہیں
جس قدر زخم ہیں چشمِ ایوب ہیں
دوستو! ان پہ مرہم لگاؤ نہیں
اب مرا دکھ فقط انتظارِ مسلسل کا آشوب ہے
اس کو جھیلوں گا مَیں
اس کو جھیلوں گا میں اُس چمک دار ساعت کے آنے تک جب لہو اپنے بدلے
کی خاطر اُٹھے
اے خدا! — اے غریبوں کے، محنت کشوں کے خدا!
ہاں ہمارا لہو جنگ ہارا نہیں

ہم کو مارا ہے ان رہنماؤں نے جو اپنے عشرت کدوں میں چہکتے رہے
ان سنہری پروں والے موزوں نے جو قوم کے واسطے نقشِ عبرت بنے
ہم کو مارا ہے ان بے ضمیروں نے جو آبرو کے جنازے میں شامل ہوئے۔

عبدالوهاب البیاتی

مرثیة الی المدینة التی لم تولد

تطنّ بالناس و بالذباب
ولدت فیها و تعلّمت علی اسوارها
الغربة و التجواب
والحب و الموت و منفی الفقر
فی عالمها السفلی والابواب
علّمنی فیها ابی قراءة الانهار
والنار والسحاب والسراب
و الرفض و الاصرار
علّمنی : الابحار
و الحزن و الطواف
حول بیوت اولیاء الله
بحثاً عن النور و عن دفء ربیع
لم یجئی بعد
و ما زال ببطن الارض و الاصداف
منتظرا نبوءة العرّاف

علّمنی فیها انتظار اللیل و النهار
و البحث فی خریطة العالم عن مدینة
مسحورة دفینة
تشبهها فی لون عینیها و فی
ضحکتها الحزینة
لکنها لاترتدی الاسمال
و خرق المهرج الجوال
ولایطن صیفها بالناس و الذباب

* * *

عبدالوہاب البیاتی

ایک شہرِ ناپید کا مرثیہ

مکھیوں اور لوگوں کی کثرت سے آٹھوں پہر گونجتا یہ مرا شہر ہے
میری آنکھیں اسی کی ہوا میں کھُلیں
اور اس کی فصیلوں پہ پھرتے ہوئے
میں نے آنکھوں سے اوجھل
مناظر کو سوچا
جنھیں دیکھنے کے لیے زندگی بھر سفر کا جہنم سہا
یہیں میں نے سیکھے محبّت کے معنی
یہیں پر نفس کے پس و پیش کا فرق جانا
یہیں میں نے دیکھا کہ کیسے گھروں سے بچھڑنے کا غم
آدمی کو زمیں کی تہوں میں چھپے عالموں کی طرح روتا ہے
اسی شہر میں مجھ کو والد نے چیزوں کی پہچان دی
اور دکھائے مجھے
دشت میں رقص کرتے سرابوں کے چکر
لپکتی ہوئی آگ، دریا، اُمنڈتی گھٹاؤں کے لشکر

نفی اور اثبات کا فرق ، نیلگوں سمندر کے بے انت منظر ،
یہ بتایا مجھے
کس طرح صبر کرتے ہیں ، کیسے بزرگوں کی پاکیزہ روحوں سے ملتا ہے فیضان
اس روشنی کا

بہاروں کی نکھری ہوئی تازگی کا
جو اب تک نگاہوں میں اتری نہیں
آستینِ زمیں میں یا بطنِ صدف میں کہیں دفن ہے
اُس مسیحا صفت کے لیے منتظر
جو اُسے کھوج کر
دہر کی تیرگی کو نویدِ مسرّت سے روشن کرے گا
مرے باپ نے مجھ کو دن رات کے انتظارِ مسلسل سے واقف کیا
اور دنیا کے نقشے پہ اس شہر کو ڈھونڈنے کی لگن
دل کو دی
وہ طلسمات کا شہرِ ناپید جو
ہوبہو
میرے اس شہر کا عکس ہے
اس کی آنکھوں کا رنگ اور پھیکی ہنسی بھی اسی شہر سی ہے
مگر اس کے تن پہ جو بے ہنر وحشیوں کا ٹھکانا نہیں
جو نہ ان چیتھڑا پوش آوارہ گردوں کی وحشت سرا ہے
نہ گرمی کے موسم میں ڈستی ہوئی مکھیوں اور لوگوں کی کثرت سے
آٹھوں پہر گونجتا ہے۔

نزار قبّانى

حوار مع اعرابى أضاع فرسه

لو كانت تسمعنى الصحراء
لطلبت اليها ان تتوقف عن تفريخ ملايين الشعراء
و تحرر هذا الشعب الطيب من سيف الكلمات
مازلنا منذالقرن السابع نمضغ الياف الكلمات
نتزحلق فى قشر الراءات
نتدحرج من اعلى الهاءات
و ننام على هجو جرير
و نفيق على شكوى الخنساء
يا بلدى ، كيف تموت الخيل ... ولا يبقى الا الشعراء ؟

مازلنا منذالقرن السابع خارج خارطة الاشياء
نترقب عنترة العبسىّ ... يجيئى على فرس بيضاء
ليفرج عنا كربتنا ...
و يرد طوابير الاعداء

مازلنا نقضم كالفئران ... مواعظ سادتنا الفقهاء ...
نقرأ "معروف الاسكافى" و نقرأ "اخبار الندماء"
و نكات جحا ... و "رجوع الشيخ" ... و قصة "داحس و الغبراء
يا بلدى الطيب ... يا بلدى ...
الكلمة كانت عصفوراً ...
و جعلنا منها سوق بغاء ...

لو كانت نجد تسمعنى
والربع الخالى يسمعنى
لختمت انا بالشمع الأحمر سوق عكاظ
و شنقت جميع النجارين ، و كل بياطرة الالفاظ
مازلنا منذ ولادتنا
تسحقنا عجلات الالفاظ
لو أعطى السلطة فى وطنى
لقطعت اصابع من صبغوا بالكلمة احذية الخلفاء ...
و جلدت جميع المنتفعين بدينار ... او صحن حساء
و جلدت الهمزة فى لغتى
و جلدت الباء ...
و ذبحت "السين" ... و "سوف" ... "تاءالتانيث" البلهاء
و الزخرف و الخط الكوفى و كل الاعيب البلغاء

و كنست غبار فصاحتنا

و قتلت قصائدنا العصماء

يا بلدى ... كيف تموت الخيل ولايبقى الا الشعراء

لو اعطى السلطة فى وطنى

أعدمت جميع المنبطحين على ابواب مقاهينا

و قصصت لسان مغنينا

و فقأت عيون القمر الضاحك من احزان ليالينا

و كسرت زجاجته الخضراء

و أرحتك يا ليل بلادى

من هذا الوحش الآكل من لحم البسطاء

يا بلدى الطيب ... يا بلدى

لو تنشف آبار البترول ... و يبقى الماء

لو يخصى كل المنحرفين ، و كل سماسرة الأثداء

لو تلغى اجهزة التكييف من الغرف الحمراء

و تصير يواقيت التيجان نعالا فى قدم الفقراء

لو اعطى السلطة فى وطنى

جردت قياصرة الصحراء من الاثواب الحضرية

و نزعت جميع خواتمهم

و محوت طلاء اظافرهم
و سحقت الاحذية اللامعة ، و الساعات الذهبية
و أعدت حليب النوق لهم
و أعدت سروج الخيل لهم ...
و أعدت النخوة ... و الاسماء العربية !

لو يكتب فى يافا الليمون لارسل آلاف القبلات
لو ان بحيرة طبريّا
تعطينا بعض رسائلها ...
لاحترق القارئ و الصفحات
لو ان القدس لها شفة ...
لاختنقت فى فمها الصلوات
لو ان ... و ما تجدى لو أن ... و نحن نسافر فى المأساة
و نمد الى الارض المحتلة حبلاً شعرى الكلمات
و نمد ليافا منديلا ... طرز بالدمع و بالدعوات ...

يا بلدى الطيب ... يا بلدى ...
ذبحتك سكاكين الكلمات !

* * *

ایک بدو سے گفتگو

جس کا گھوڑا کھو گیا ہے

اگر یہ صحرا مری سنے تو اسے بتاؤں

یہ شاعروں کا گروہ فصلِ زوال ہے، تو اُسے مٹا دے یا اس کے منہ سے وہ لفظ لے لے

جو کتنی صدیوں سے زہر صورت ہماری نسلوں کو کھا رہے ہیں

یہ بانجھ لفظوں کی ڈگڈگی جو ہمارے کانوں میں بج رہی ہے خموش کر دے

یہ لفظ بازی کا شوق جسموں میں کوڑھ کی مثل پھیلتا ہے!

ورودِ شب ہو تو لفظ آنکھوں میں نیند بنتے ہیں

پَو پھٹے تو حروفِ ابجد کا خواب سایہ پکارتا ہے!

مرے وطن یہ عجیب قصّہ ہے

مردِ میداں تو کھیت رہتے ہیں اور شاعر

زمیں کے سینے پہ حسبِ سابق رواں دواں ہیں

یہ لفظ بازی ہے جس کے باعث ہمارے ہاتھوں میں کچھ نہیں ہے زمیں کے نقشے پہ ہم مقاموں سے ماورا ہیں۔

ہماری آنکھوں میں آنے والے سراب لمحوں کے خواب سجتے ہیں اور کمانوں میں اس

کے گھوڑے کی ٹاپ بجتی ہے جو ہمارے دلوں کو غم سے نجات دے گا، جو دشمنوں کی صفیں
اُلٹ کر شکست دے گا۔

ہم عالموں کے نصائح سنتے ہیں اور فقیہوں کی نکتہ سنجی پہ جھومتے ہیں
ہماری آنکھوں کو داستانوں کی وادیوں میں سکون ملتا ہے، داستانیں جو بانجھ لفظوں کی
بے حقیقت جوانیاں ہیں
مرے وطن اے زمین میری!
فغاں! کہ ہم نے وہ لفظ جنسِ دکانِ اہلِ ہوس بنایا
جو قاصدانِ بہار جیسا سبک نوا تھا
حرم کے طائر سا خوش نما تھا

اگر یہ صحرائے نجد میری فغاں سنے تو اسے بتاؤں
مرے تصرف میں ہو تو لفظوں کے کارخانوں کو سُرخ مُہروں سے بند کر دوں، حروفِ ابجد کے
شہسواروں کو قتل کر دوں، کہ یہ ہم کو لفظوں کی چکیوں میں کچل رہے ہیں
گر ایں اپنے وطن میں کوئی مقام رکھتا
تو ایسے لوگوں کی انگلیوں کو تراش دیتا
جو اپنے لفظوں کو ظالموں کے غلیظ جوتوں پر پھیرتے ہیں
اور ان میں ایسی چمک دکھاتے ہیں، جو بھی دیکھے خود اپنے چہرے سے دو بہ دو ہو
تونگروں کے مصاحبوں کو ذلیل کرتا
جو شوربے کی مہک پہ کتوں کی مثل ہونٹوں کو چاٹتے ہیں
اور ان کو لفظوں کے سخت دُرّوں کی مار دیتا
جو اہلِ زر کی مدح سرائی میں جھوٹ کی فصل کاٹتے ہیں

میں ایسے لفظوں کو کاٹ دیتا جو بے ہنر ہیں
اور آنے والے دنوں کی جھوٹی تسلیوں سے ہر ایک منظر کو دیکھتے ہیں
میں لفظ بازوں کے سارے کھیلوں کو، مشغلوں کو، فصاحتوں اور صنعتوں کو
وطن کی حد سے نکال دیتا، اور اُن قصیدوں کو پھاڑ دیتا
جو اگلے وقتوں کے خواب دے کر گزرتے لمحوں کو روندتے ہیں
مرے وطن یہ عجیب قصہ ہے
مردِ میداں تو کھیت رہتے ہیں اور شاعر
زمیں کے سینے پہ حسبِ سابق رواں دواں ہیں

اگر مجھے دسترس ہو کوئی
تو قہوہ خانوں کی سیڑھیوں میں پڑے ہوئے ان زباں پرستوں کو قتل کر دوں جو کشتِ افسوس بو رہے ہیں
تراش ڈالوں زبان ان کی جو اپنے نغموں سے داغِ ذلت کو دھو رہے ہیں
تباہ کر دوں فلک پہ ہنستے ہوئے قمر کو جو ہم پہ مٹی اڑا رہا ہے!
وطن میں تیری اُداس شب کو نجات دے دوں اس آئینے سے جو تیری ذلت کی داستانیں سنا رہا ہے۔

مرے وطن اے زمین میری
مری دعا ہے کہ سوکھ جائے ترے کنوؤں کی یہ بہتی دولت سوائے پانی کے سب فنا ہو
جو تیری چاہت سے منحرف ہیں ـــــ انھیں سزا ہو۔
جو بیٹیوں کو سجا کے گاہک کو ڈھونڈتے ہیں، انھیں ہوس کا عذاب پہنچے

وہ اپنے جسموں میں کوڑھ دیکھیں پر موت ان کی طرف نہ آئے!

میں چاہتا ہوں

تونگروں کے محل — محلوں کے سُرخ کمرے

جدید سائنس کے معجزوں کے کمال، کلچرل کی خوش نمائی

سفید آقاؤں کی وراثت، جلا وطن ہو

حسین تاجوں میں جگمگاتے ہوئے جواہر

غریب لوگوں کی جوتیوں میں مقام پائیں

اگر وطن میں مجھے کوئی اختیار ہو تو میں اپنے صحرا

میں پلنے والے نئے امیروں کے بھاری خلعت اتار پھینکوں

یہ ارضِ یورپ کے سارے تحفے جو جگمگاتے ہیں مسخ کر دوں

اور ان کے چہروں کو اُس ملمع سے پاک کر دوں جسے سجا کر یہ اپنے اہل وطن سے ظاہر
میں مختلف ہیں

انھیں بٹھاؤں بغیر زینوں کی گھوڑیوں پر

سُلاؤں صحرا کی سرد راتوں میں جب سروں پہ کھلا فلک ہو

پلاؤں ان کو وہ دودھ جس سے نظر میں ان کی وہی چمک ہو جو ان کے ناموں کا حاشیہ ہے۔

عرب شجاعت کا اور غیرت کا نام جس سے تمام تاریخ آشنا ہے

اگر یہ ہوتا کہ ہیٹر یافا کے اپنی شاخیں قلم بناتے تو ہم کو لاکھوں سلام دیتے

جو طبریا کا اُداس پانی ہمیں جدائی کا حال لکھتا

تو کاغذوں میں وہ آگ لگتی کہ پڑھنے والے کباب ہوتے

اگر دہانِ قدس میں کوئی زبان ہوتی تو اس کے ہونٹوں پہ آرزوں کے لفظ ہوتے

مگر یہ سب کچھ "اگر" کے صحرائے بے جہت کا غبار ہے کہ ہم ایک ایسے کی ڈگر پہ
رواں دواں ہیں

حروفِ ابجد کو ہم نے اپنا نشاں کیا ہے
ہم اپنی کھوئی ہوئی زمین پر کمندِ افسوس پھینکتے ہیں جو شاعری سے ٹبی گئی ہے!
ہمارے دامن پہ آنسوؤں کے اور آرزوؤں کے بیل بوٹے ہیں اور ہم نے اسی کو یافا کی رہ
گزاروں میں وا کیا ہے۔

مرے وطن اے زمین میری!
فغاں کہ تجھ کو فضول لفظوں کی کُند چھریوں نے کاٹ ڈالا

نازك الملائكه

الضيف

طرق الباب و كنا فى ذهول سادرين
جوّنا جلّله الصّمت الحزين
و على آفاقنا يجثم ليل لايبين
طرق الباب فقلنا : زائر جاء الينا
علّه يلقى من الغيب علينا
بعض وعد عن ديار سرقت منذ سنين
علّه يطفئ نيران الحنين
و فتحنا الباب ملهوفى المآقى صائحين :
"ضيفنا ! من انت ؟" قال "الفرح
جئت جذلان معى ضوء و لحن مرح"
فصفقنا الباب ، أخلينا من العطر يدينا
و طردنا الضيف عن ابوابنا ، عن مقلتينا
و على نجوى فلسطين انطوينا
ضيفنا الحزن الضبابى و دنيانا الحنين

و مضينا صامتين

ثم عاد الباب ينطرق
بيتنا كان كئيباً فى بحور الصمت مغرق
و مآقينا على اهدابها الدمع تألّق
و سمعنا الطرق قمنا سائلين
من ترى يقلق مأوانا الحزين
فى ضباب الليل و الصمت الضنين ؟
"ضيفنا من انت ؟ من" قال : "الهوى الحلو المزنبق
جئت فى كفى شهد يترقرق -"
فصفقنا الباب صحنا "لانريد
نحن حرّمنا الهوى ، لن نتذوق
قبل ان نثأر للشعب الشريد
من مذلّيه جميعاً و نعيد
ارضه المسروقة الولهى و مأواه الطعين
انصرف ياضيفنا ان الانين
و الاسى احنى على الروح و اشفق"
و صفقنا بابنا و الحزن احدق
باغانينا و عدنا نندب الشعب الممزّق

ثم هزّت بابنا ذات صباح يد ضيف
طرقت كفّاه فی عصف و عنف
لم يكد يمهلنا حتی هزعنا راكضين
نسبق الخطو اليه هاتفين :
"ضيفنا من انت ؟" قال "الغضب
جئت فی كفیّ كؤوس من لظی تلتهب"
ففتحنا الباب أنزلناه فی ركن مكين
من دسانا و احتضناه و ثرنا صارخين :
ان تكن ناراً فنحن الحطب
انفجر يا غيظ و ارتجی بنا يا حقب
قدتهاوی اسنا المنتحب
و مضت عنا سنين الصبر و الياس المهين
ضيفنا الحرّ الجبين
كل خشن فی روابينا سيصفو و يلين
و سنسترجع يافا و جنين
فانفجر يا لهب !
نحن انصارك نحن العرب .. "

* * *

مہمان

اُس کی دستک کے سمے وقفِ تحیر ہم لوگ
دشتِ غفلت میں کھڑے دیکھتے تھے
بے سحر رات کی بے فاصلہ پہنائی کو
خاک سے تا بہ فلک کھلتے چلے جاتے تھے
لشکرِ غم کے علم
اس کی دستک کی صدا سن کے کوئی کہنے لگا
آخرِ کار کوئی آیا ہے
وہ چمن جس کو غنیموں نے خزاں بخت کیا
اُس کے بارے میں کوئی اچھی خبر لایا ہے
قاصدِ ارضِ وطن آیا ہے!
شاید اُس پاس کوئی ایسی خبر ہو جو ہمیں
غم کے بے نام الاؤ سے رہائی دے دے
نطقِ خاموش کو پھر نغمہ سرائی دے دے
ہم نے روتی ہوئی آنکھوں سے اٹھائیں پلکیں
اور اُمید بھرے دل سے کہا

"اے گئی رات کے مہمان! بتا کون ہے تُو"
اُس نے کہا:

"میں مسرت ہوں، مرے ساتھ ہیں روشن نغمے
انبساط اور خوشی
کھلتے پھولوں کی مہک، پھوٹتی کلیوں کی ہنسی"
اپنے دروازے سے آنکھوں کی گزرگاہوں تک
ہم نے مہمان کو رستہ نہ دیا، عطر کو پھینک دیا
اور کھولے ہوئے دروازے کے پٹ بھیڑ دیے!
پھر وہی ہم تھے، وہی ارضِ فلسطین تھی، وہی درد کا جال، وہی سرگوشیاں کانوں میں،
وہی شامِ ملال
شوق کے کربِ مسلسل میں گرفتارِ خیال
اُسی خاموش خرابے میں گراں گام تھے ہم

پھر صدا گونجی کسی دستک کی
اس گھڑی گھر کے در و بام پہ غم لکھا تھا
قصۂ عہدِ ستم لکھا تھا

ہم اُٹھے اور کہا:
"کون اس خانۂ ویراں کا سکوں لوٹنے آنکلا ہے؟
دھند میں ڈوبی رات کی سرحد سے ادھر
کون بے فیض خموشی میں چلا آیا ہے؟
دکھ بھری رات کے مہمان، بتا کون ہے تُو"

اس نے کہا :

" میں گلِ سبز کی خوشبو میں بسی خواہش ہوں

دیکھ یہ مہکا ہوا شہد مرے ہاتھ میں ہے !"

ہم نے دروازے کے پٹ بھیڑ دیے اور کہا

" دکھ بھری رات کے مہمان ! ہمیں تنگ نہ کر

ہاں پلٹ جا کہ ہمیں تجھ سے کوئی کام نہیں

خواہشں ہم کو نہیں ہیں جائز

جب تلک قوم کی یہ دربدری باقی ہے

ہم انھیں پاس نہ آنے دیں گے

ہم نے دشمن کو ابھی اپنی تباہی کا بدل دینا ہے

اس کو پیغامِ اجل دینا ہے

جب تلک ہاری ہوئی قوم کو ہم

اس کی لوٹی ہوئی توقیر نہیں لوٹاتے

خواہشیں ہم کو نہیں ہیں جائز

دکھ بھری رات کے مہمان ہمیں تنگ نہ کر

ہاں پلٹ جا کہ ابھی غم کی صدا اور ندامت کی ہوا

روح کو تجھ سے بھلی لگتی ہے

ہم نے دروازے کے پٹ بھیڑ دیے

اور کھوئی ہوئی منزل کے لیے

دکھ بھرے گیتوں میں پھر قوم کا غم لکھنے لگے ۔

ایک دن صبح سمے پھر کوئی دستک گونجی
اس قدر تیز کہ یوں لگتا تھا
جیسے مہمان کے ہاتھوں میں ہو طوفاں کا ہاتھ
دشتِ غفلت میں چھناکے سے ہوئے
اور آنکھوں میں چمک سی اُتری
ہم نے بے تابی سے دروازے طرف جا کے کہا
"اے نئی صبح کے مہمان! بتا کون ہے تُو؟
تیری دستک میں یہ طوفان کا عالم کیوں ہے؟
اُس نے کہا:
"میں غضب ہوں
اشتعال اور تلاطم ہے نشانی میری
میرے ہاتھوں میں ہیں شعلوں کے چھلکتے پیالے"
ہم نے دروازے کے پٹ کھول دیے
اپنے مہمان کے قدموں میں جھکے
اور آنکھوں سے اٹھا کر اس کو، دل کی محبوب بتوں میں رکھا
اور پھر غیظ میں اُٹھ کر چیخے:
" اے نئی صبح کے مہمان ہمیں تیری قسم!
تُو اگر آگ ہے، ہم لوگ ہیں ایندھن تیرا
اے غضب، جوش میں آ
رات کا عہد ستارے کی طرح ٹوٹ کے گم نام ہوا
سال ہا سال کی رسوائی بھری خاموشی

اور برداشت کا غم ختم ہوا

اے چمکتی ہوئی پیشانی کے مالک مہمان!

دیکھ ان ریت کے ٹیلوں میں بھٹکتی ہوئی اس قوم کا دل

آگ کا زخم ہوا

ہو وہ یافا کہ جنین

اپنی چھوڑی ہوئی مٹی کا ہر ایک ذرۂ پاک

دستِ دشمن سے ہمیں لینا ہے

انتقام اور غضب کے شعلے! اور بھڑک

ہم عرب لوگ ہیں انگار ترے

ہم ترے ساتھ ہیں اور ساتھ رہیں گے تیرے

اور بھڑک

انتقام اور غضب کے شعلے — اور بھڑک

محمود درويش

- - و يُسدل الستار

عندما ينطفئ التصفيق
في القاعة ،
و الظّل يميل
نحو صدري - -
يسقط المكياج عن وجه الجليل
و لهذا - - استقيل !

أجد ، الليلة ، نفسي
عارياً
كالمذبحة
كان تمثيلي بعيداً عن مواويل ابي
كان تمثيلي غريباً عن عصافير الجليل
و ذراعي مروحه
و لهذا - - استقيل

لقّنونى كل ما يطلبه المخّرج
من رقص على ايقاع اكذوبته
و تعبت الآن ،
علّقت اساطيرى على حبل غسيل
و لهذا - - استقيل !

باسمكم ، اعترف الآن بان المسرحيه
كُتبت للتسليه
رضى النقاد ، لكن عيون المجدليه
حفرت فى جسدى
شكل الجليل
و لهذا - - استقيل -

يا دمى !
فرشاتهم ترسم لوحات عن اللد ،
و الت الجبر ،
ما يافا سوى جلد طبول
و عظامى كالعصا فى قبضة المخرج
لكنى اقول :
أتقن الدور غداً ، يا سيّدى !

و لهذا . . استقيل !

―――――

سيّداتى ، آنساتى ، سادتى !

ملّيتكم عشرين عام

آن لى ان ارحل اليوم

و ان اهرب من هذا الزحام

و اغنى فى الجليل

للعصافير التى تسكن عشّ المستحيل

و لهذا . . استقيل .

استقيل

استقيل . .

*   *   *

محمود درویش

پردہ گرتا ہے

جب تالیوں کے شور سے گونجی ہوئی فضا ، ہوتی ہے بے صدا
سایہ سا ایک ہال کے
سقف و در و دیوار سے
چلتا ہے اور پھیل کے گرتا ہے ، گر بہ پا ، دل کا مرے طواف
ہٹتا ہے "الجلیل"[1] کے چہرے سے پھر غلاف
سو اس لیے ہے پیش مرا آخری سلام

میں خود کو دیکھتا ہوں برہنہ تمام رات
جیسے ذبیحہ خانہ میں رکھا ہوا بدن
دیکھے تھے میرے باپ نے ارماں بھرے جو خواب
میرا یہ کھیل ان کی نہ تعبیر بن سکا
بخشی تھی "الجلیل" کی چڑیوں نے جو نوا

---

[1] : شاعر کا وہ گاؤں جو اسرائیل کے قبضے میں چلا گیا۔

میرا یہ کھیل ان کی نہ تفسیر بن سکا
ماتھا مرا پسینے میں ڈوبا ہے اور مَیں
ہاتھوں سے دھو رہا ہوں ندامت کی گرد کو
سو اس لیے ہے پیش مرا آخری سلام

کہتے تھے "جو پسند ہے ہم کو وہی لکھو
جس نے رقم لگائی ہے اس کا کہا کرو"
دھن تھی سفید جھوٹ کی، لیکن وہ ذی وقار
کہتے تھے "اس پہ رقص کرو، گیت بھی لکھو"
لیکن میں تھک گیا ہوں، بہت اس کماں سے
رکھنے لگا ہوں طاق پہ فرضی کہانیاں
سو اس لیے ہے پیش مرا آخری سلام

واللہ، یقین جانیے، مقصد نہ تھا کوئی
لکھا تھا میں نے کھیل یہ تفریح کے لیے
تعریف اس کی ناقدوں نے، اہلِ فن نے کی
لیکن مجھے لگا
اس کی نگاہیں چیر رہی ہیں مرا وجود
"اُس" نے مرے بدن کی زمین کھرچ کھرچ کر
ہر ایک مُو پہ نقش لکھا "الجلیل" کا
سو اس لیے ہے پیش مرا آخری سلام

اے میرے رخوں، مہکتے ہوئے بے نشان لہو
تصویر کش ہیں بغض و عداوت کے وہ قلم
جن کے لیے سیاہی کا منبع بنا ہے تو!
یا فائٹ ہے جیسے ڈھول پہ چمڑا کسا ہوا
اور اہلِ زر کے ہاتھ میں میرے یہ استخواں
چھڑیوں کی ہیں مثال
ہلتے ہیں میرے ہاتھ، دیتا ہے کوئی تال
ہر رات ناظرین سے کہتا ہوں جھک کے میں
"کل گر حضور آئیں تو وعدہ ہے یہ مرا
کردار اپنا آج سے بہتر کروں گا میں"
سو اس لیے ہے پیش مرا آخری سلام

اُونچے گھروں کے اعلیٰ و ارفع اے ناظرین!
لکھا ہے میں نے بیس برس آپ کے لیے
زندہ رہا ہوں آپ کی تفریح کے لیے
لیکن یہ وقت ہے کہ کروں آخری سلام
سیلابِ رنگ و نور کی موجوں سے بھاگ کر
گاؤں میں "الجلیل" کی گلیوں میں صبح و شام
گاؤں میں "الجلیل" کی چڑیوں کے روبرو

ؔ : وہ اسرائیلی شہر جہاں شاعر کام کرتا ہے۔

بھرتی ہیں جو محال اُمیدوں میں رنگ و بو
اڑتی ہیں اپنے خواب کی مستی میں بے مقام
سو اس لیے ہے پیش مرا آخری سلام
—— مرا آخری سلام —— مرا آخری سلام

محمود درويش

الدانوبُ ليس أزرق

هى لا تعرفه ،
كان الزمان
واقفاً ، كالنهر ، فى جثته
قالت له : جسمى مكان - -

كان ذاك اليوم صيفياً
و كان العاشقان
يستردان من الرزنامة الاولى
حساب الشمس
كان الامس
و الحاضر كان - -

هى لا تعرفه
قالوا لها : يأتى مع النهر

الذى يأتى من الفجر ،
و كان التوأمان
ضفتى نهر . . يسيران معاً
او يقفان
و هما . . لايعرفان !
كان ذاك اليوم حقلاً
من ذبول و حنان
و هما يقتربان
و يموتان من الموت
و لا يلتقيان !

هى لا تعرفه
لكنهنا تشربه كالماء فى مل الزمان .
بعد عامين من الهجرة فى الهجرة
ماتا
فى انفجار القنبلة الاولى
و فى جثته ، كان الزمان
واقفا كالنهر فى جثته
قالت له :
جسمى مكان !

* * *

محمود درویش

ڈینیوب نیلا نہیں ہے

نہ تھی، وہ اس سے آشنا
" زماں" اس آدمی کے جسم میں رکا تھا مثلِ بحرِ بے کراں
وہ پکاری " اے زماں!
جسم ہے میرا مکاں"

تو گرمیوں کے ایک دن
وہ دونوں اہلِ عشق اپنے بخت سے تھے ملتجی
ان دنوں کے جن کے چہرے کھو گئے تھے
جن میں گزرا کل بھی تھا، گریز کرتا آج بھی

نہ تھی وہ اس سے آشنا
تمام لوگ کہہ رہے تھے صبح دم وہ آئے گا
مثالِ بحرِ بے کراں ۔ رواں دواں
نہ تھی وہ اس سے آشنا

کہ اس کا اپنا آپ بھی تھا آنے والے کا نشاں !
کہ وہ کناروں کی طرح تھے ہم سفر
کبھی رُکے ، کبھی رواں
اگرچہ ساتھ ساتھ تھے مگر تھے دونوں بے خبر

وہ گرمیوں کا دن اک ایسا کھیت تھا
کہ جس کی خاک میں نہاں تھی مہر و اُنس کی نمی
طویل خشک سالی بھی
وہ ایک دوسرے کی دسترس سے دور تھے مگر
قریب تھے کہ موت کے سفر میں ہم رکاب تھے
نہ تھی وہ اس سے آشنا
مگر وہ جذب کر رہی تھی اس کو اپنے آپ میں
کہ وہ "زماں" کی ریت تھا تو یہ مثالِ آب تھی
جسم تھا اس کا "مکاں"

وہ بے گھڑی کی تیرگی میں دو برس کے بعد ہی
وطن کے آسمان سے دور ، مر گئے
بس ایک بم کی گونج سے
زماں جو مرد کے بدن میں بحرِ بے کراں کی مثال تھا رواں
ٹھہر گیا۔
وہ پکاری "اے زماں !
جسم ہے میرا مکان"

محمود درويش

قراءة في وجه حبيبتي

و حين احدّق فيک
اری سُدنا ضائعة
اری زمنا قرمزیا
اری سبب الموت و الکبریاء
اری لغة لم تسجل
و آلهة تترجّل
امام المفاجأة الرائعه !
- - و تنتشرین امامی
صفوفا من الکائنات التی لاتسمّی

و ما وطنی غیر هذه العیون التی
تجعل الارض جسما - -
و اسهر فیک علی خنجر
واقف فی جبین الطفوله :
هو الموت مفتتح اللیلة الحلوة القادمة

و انت جميلة
كعصفورة نادمة !
و حين احدّق فيك
و اثيوبيا
و الطفوله

و اقرأ خارطة الانبياء
و سفر الرضا و الرذيلة
ارى الارض تلعب
فوق رمال السماء
ارى سببا لاختطاف المساء
من البحر ـ ـ
و الشرفات البخيلة ـ ـ

* * *

محمود درویش

چہرۂ محبوب کی تحریر

مبہوت بچے کی طرح سے ٹکٹکی باندھے ہوئے
دیکھتا ہوں جب بھی میں چہرہ ترا
دیکھتا ہوں ایک شہرِ بے بشر
ایک عہدِ قرمزی و رہ گزارِ موت و شانِ کبریا۔
اور وہ بولی کہ جو رائج نہیں
اور وہ عالی مراتب لوگ جو عرشِ معلّیٰ سے اتر کر
خاک کی اس بے کرانی میں مسافر ہو گئے
اور پھر تو پھیلتی ہے مُو بہ مُو
میری نظر کے رُو برو
صف بہ صف پھیلی ہوئی بے نام دنیا کی طرح۔

یہ زمیں اک جسم ہے اور آنکھ ہے میرا وطن
بچپنے سے میری پیشانی پہ ایک خنجر کا زخم تیز ہے
اور آج بھی میں
تیری یادوں کے جلو میں جاگتا ہوں
یوں گماں ہوتا ہے جیسے آنے والی ساری خوشیوں کا مکاں

موت کے پرلی طرف ہے
اور اس جانب ہے تُو
اے شہِ حسن و جمال
آشیاں گم کردہ اور نادم پرندے کی طرح
ٹکٹکی باندھے ہوئے مبہوت بچے کی طرح
دیکھتا ہوں جب بھی میں چہرہ ترا
یاد آتا ہے مجھے وہ عرصۂ کرب و بلا
اور جشن
اور اذیت سے پھڑکتا بچپنا۔

پھر میں بیتوں کے نقوشِ پا کے نقشے
اور اک ایسی مسافت کی کہانی
پڑھتا ہوں جس میں ہزیمت، شادکامی اور ذلت
ایک دوجے کے جلو میں درج ہیں
یوں گماں ہوتا ہے جیسے یہ زمیں
محوِ طرب ہے آسماں کی ریت پر
جی میں آتا ہے کہ جڑ سے نوچ کر
پھینک دوں میں شام کے اس جھٹپٹے کو ناگہاں
اس سمندر اور ان اُونچے محلوں سے پرے
جن میں ہیں بے فیض اور محکومِ موسم حکمراں۔

محمود درويش

امرأة جميلة فی سدوم

ياخذ الموت على جسمک شکل المغفرة
و بودی لو اموت
داخل اللّذة يا تفاحتی
يا امرأتی المنکسرة
و بودی لو اموت
خارج العالم فی زوبعة مندثره !

(للّتی اعشقها وجهان :
وجه خارجِ الکون
و وجه داخل سدوم العتيقة
و انا بينهما
ابحث عن وجه الحقيقة)

صمت عينيک ينادينی الی سکّين لشوة
و انا فی اول العمر ،

رأيت الصمت

و الموت الذى يشرب قهوه

و عرفت الداء و الميناء

لكنك ... حلوه !

———

- - و انا انتشر الآن على جسمك،

كالقمح - - كاسباب بقائى و رحيلى ه

و انا اعرف ان الارض امّى

و على جسمك تمضى شهوتى بعد قليل

و انا اعرف ان الحب شيئ

و الذى يجمعنا ، الليلة ، شيئ

و كلانا كافر بالمستحيل

و كلانا يشتهى جسما بعيدا

و كلانا يقتل الآخر خلف النافذة !

———

(التى يطلبها جسمى - -

جميله

كالتقاء الحلم باليقظة ،

كالشمس التى تمضى الى البحر ،

بزى البرتقاله -

و التی یطلبها جسمی ـ ـ
جمیله
کالتقاء الیوم بالامس
و کالشمس التی یأتی الیها البحر
من تحت الغلاله)

لم نقل شیئا عن الحب
الذی یزداد موتا
لم نقل شیئا ،
و لکنا نموت الآن
موسیقی و صمتا
و لماذا ؟ و کلانا ذابل
کالذکریات الآن ،
لایسأل : من انت ؟
و من این اتیت ؟
و کلانا کان فی حطین
والایام تعتاد علی ان تجد الاحیاء
موتی ...
این ازهاری ؟
ارید الآن ان یمتلئ البیت زنابق

اين اشعاری ؟
اريد الآن موسيقی السکاکين التی تقتل
کی يولد عاشق
و اريد الآن ان انساك
کی يبتعد الموت قليلا
فاحذری الموت الذی
لا يشبه الموت الذی
فاجأ اُمّی ...

———

(التی يطلبها جسمی
لها وجهان :
وجه خارج الکون
و وجه داخل سدوم العتيقه
و انا بينهما
ابحث عن وجه الحقيقه)

* * *

محمود درویش

شہرِ سدوم کی حسینہ

تمھارے بدن کے خم و پیچ پر مغفرت، کی طرح موت وارد ہوئی
کاش میری بھی اس طور موت ہو!
تلذذ کے لمحے میں اے میری جاناں،
مری پُر شکستہ، بری چشم، عورت
کاش میری بھی اس طور ہی موت ہو،
فنا و بقا کی حدوں سے اُدھر
اک بگولے کے بکھرے ہوئے انت میں

(وہ جو محبوب ہے اس کے دو روپ ہیں
ماورائے جہاں ایک ہے — دوسرا
شہرِ سدوم کی گمنگی میں نہاں
اور مجھ کو انہی دو حدوں کے میاں،
جستجو ہے حقیقت کے کھوئے ہوئے روپ کی)

تمھاری نگاہوں میں لکھی ہوئی خامشی
مجھ کو مجھ سے اٹھا
بے خودی کی صلیبوں پہ مصلوب کرتی ہے — بچپن مرا
خامشی کے اسی منظرِ بے اشارہ کی زینت بنا
میں نے دیکھا اُسے
موت کے روپ میں قہوہ پیتے ہوئے ،
مجھے روگ کا ، اور اس کی دوا کا
ہمیشہ سے ہی علم تھا ، تو مگر . . . .
بہت خوب صورت ہے اے میری جاں
تمھارے بدن کے خم و پیچ پر میں ہوں پھیلا ہوا
تمھارا بدن !
جو کہ گندم کے دانے کی تمثیل ہے
نیستی اور ہستی کی تصویر ہے
مجھے علم ہے یہ زمیں میری ماں ہے !
تمھارے بدن پر مری سُرخ شہوت نے جو کچھ لکھا ہے ، غبارِ فنا ہے !
مجھے علم ہے
کہ محبت الگ چیز ہے اور یہ
اور ہی چیز ہے
جس کے جادو میں ہم
آج کی شب تعلق کی ڈوری میں الجھے ہوئے
ایک دوجے کے جسموں سے بدمست ہیں !

ہم میں ہر ایک کو سر پہ لٹکے حقائق سے انکار ہے
ہر کسی کو ہوس ہے کسی اور ہی جسم کی
جو بہت دور ہے! ہاتھ ہے نارسا
ہم میں ہر ایک، اک دوسرے کو
دریچے کے پیچھے، فضا میں بھی آہٹیں
بھیجتا ہے سدا۔

(وہ جس کی مرے جسم کو ہے طلب
خوب صورت ہے یوں
جس طرح خواب بیداریوں سے ملے
جیسے سورج سمندر میں نارنجی ملبوس پہنے ہوئے
یک بیک چل پڑے،
وہ جس کی مرے جسم کو ہے طلب
خوب صورت ہے یوں
جس طرح "آج" "گزرے ہوئے" "کل" میں پھر سے جیے
جیسے سورج کی جانب سمندر بہت ہمہمے سے بڑھے
اور تلاطم کا ملبوس تک چھوڑ دے)

محبت کے بارے میں ہم کچھ نہ بولے
جو لمحہ بہ لمحہ فنا ہو رہی ہے
کسی کے بھی بارے میں ہم کچھ نہ بولے

مگر اب کہ ہم آپ ہیں

غنا اور خموشی کے اس ایک لمحے میں رزقِ فنا

کیا خبر کس لیے

ہم میں ہر ایک مغموم ہے، جس طرح

یادِ ماضی کے گرداب میں یہ کوئی دوسرے سے نہیں پوچھتا

"کون ہے تُو، کہاں پر ہے تیرا وطن"

جب کہ حطّین میں ہم سبھی ایک دُوجے کی پہچان تھے

زمانے کی گنتی مگر اور ہے

یہ ہمیشہ سے ہی

مر چکے اور زندوں کے مابین تفریق کرتا نہیں

کھو گیا ہے کہاں

میرا پھولوں سے مہکا ہوا گلستاں؟

گھر مرا سُو بہ سُو

بھر چنبیلی کے پھولوں سے ہو مُشک بو—!

کہاں چھن گئی ہے مری شاعری؟

ہے مجھے یہ جنوں

ان کٹاروں کا آہنگ مجھ کو ملے

کاٹ دے رشتۂ قلب جن کا فسوں

اور تخلیق ہو

آرزو کی تمازت سے دہکا ہوا ایک عاشق کا دل!

اور اب میں تمھیں بھولنا چاہتا ہوں
کہ سر پہ کھڑی موت سے کچھ تو مہلت ملے!
اور اس موت سے تو بھی دامن بچا
جو مماثل نہیں اس رُخِ موت سے
جس کا سواگت مری بوڑھی ماں نے کیا۔

(وہ جس کی مرے جسم کو ہے طلب
اس کے دو روپ ہیں
ماورائے جہاں ایک ہے ۔ دوسرا
شہرِ سدّوم کی گھنگی میں نہاں
اور مجھ کو انھی دو حدوں کے میاں
جستجو ہے حقیقت کے کھوئے ہوئے روپ کی)

سميح القاسم

ما تيسر من سورة السلاسل

عبثاً تقترف الاسلاك موتى
عبثاً يطبق ليل و جدار
فى دمى يصهل مزمار النهار
و على عينىّ الوانى
و فى فكىّ صوتى !

———

أقبلى من شاطئ الاعراف يا ارواح اهلى
أقبلى ليلةَ عُرسى و اشهدينى
رافعاً فى غبطةَ الموت جبينى
و اشهدينى ناصع الحزن اصلىّ
لشهيد الياسمين ! !

———

المغنى ساهر . . و العازفون
لن يناموا

فامنحينا نعمة الاصغاء يا روح بلادی
و اقبلی مزمورنا المزهر فی ملح السجون . .

لم تزل رزنامة السجن طويلة
و الاغانی لم تزل تسخر من آسرها
لم تزل رزنامة السجن طويلة
و انا انتزع الاوراق من آخرها !

عندما يختلط الحابل بالنابل بی
فی غموض الفكرة المفتعلة
افهم البسمة فی وجه ابی
يوم أردوه قتيلا
و اری الرعب هيولی
فی وجوه القتلة !

ما الذی تفعله بوابة السجن الغبيّة
باناشيدی و ازهاری و حبّی
ما الذی تفعله بوابة السجن الغبيّة
بالمفاتيح التی تملأ جيبی ؟ !
ما الذی يفعله داء المفاصل

فى الزنازين ،
و آلات العذاب
عندما يصبح دفن الوجه فى طقس التراب
عالما بالسحر و الغبطة حافل !

ما الذى تفعله قضبان سجنى
ما الذى تفعله ،
مادام عمرى
فى زمان الحب برهه
مادام حبسى
طُرفة . .
و الموت . . . نزهة ؟ !

* * *

ہاں چلے حلقۂ زنجیر کی بات

نہیں سلاخوں کے بس میں مجھ کو ہلاک کرنا
فصیلِ زنداں نہ روک پائے گی راہ میری
فضول ہے یہ شبِ سیہ کی تباہ کاری
کہ میرے خون میں چمکتے دن کی نفیریاں ہیں
نظر میں اپنے ہی رنگ چھائے ہیں
اور ہونٹوں پہ جو صدا ہے وہ حرفِ جاں ہے

گئے ہوؤں کی عزیز روحو!
کبھی تو برزخ کی سرحدوں سے نکل کے آؤ
کبھی تو میرے زفاف کی شب میں مجھ کو دیکھو
کبھی تو دیکھو کہ کیسے میں نے فنا سفر میں
جبین اپنی بلند رکھی
کبھی تو دیکھو کہ کیسے میں نے
سدرۂ غم میں جانے والوں کی مغفرت کی دعائیں مانگیں

مغنیوں کی صدائیں راتوں میں گونجتی ہیں
لرز رہے ہیں تمام سازوں کے تار جیسے
کبھی نہ سوئیں گے اہل نغمہ
مرے وطن، اے متاعِ ہستی ۔۔۔ کبھی تو سن لے
کہ ذرہ ذرہ تری سماعت کا منتظر ہے
قبول کر لے ہمارا نغمہ
جو پھول بن کر نواحِ زنداں کی شور مٹی میں کِھل اٹھا ہے

بہت بڑی ہیں قفس نشینوں کی داستانیں
اور ایک بے باک قہقہہ ہے یہ گیت ان پر
جو اس کی بندش کے مدعی ہیں
بہت بڑی ہیں قفس نشینوں کی داستانیں
میں ان کے آخر کے ظلم صفحوں کو ایک اک کر کے پھاڑتا ہوں

کبھی کبھی جب مری بصیرت شکست کھاتی ہے،
اور سوچیں، اجبت بھلا کو بھٹکنے لگتی ہیں،
میری آنکھوں میں کوندجاتا ہے اپنے والد کا وہ تبسم
جو موت لمحے میں اس کے چہرے پہ ضو فگن تھا
دکھائی دیتے ہیں قاتلوں کے سیاہ چہرے
جو خوف و دہشت کے سرد جالے میں کانپتے ہیں

مجھے قفس کے محافظوں سے خطر ہی کیا ہے

کہ ان کے بس میں نہ گیت میرے، نہ پھول میرے، نہ میری چاہت

مجھے قفس کے محافظوں سے خطر ہی کیا ہے!

کہ دسترس میں نہیں ہیں ان کی

وہ کُنجیاں، جن سے میری جیبیں بھری ہوئی ہیں

مجھے کسی عارضے کا ڈر ہے، نہ ان فصیلوں

میں بربریت کے شاہکاروں کا خوف کوئی

کہ جب بھی چاہوں

نئی مسرت سے پُر زمینوں کی سُرخ مٹی میں منہ چھپانا

ہے میرے بس میں

نہیں ہے کچھ بھی سلاخِ زنداں کی دسترس میں

کہ میری ساری حیات لمحہ ہے۔ ایک لمحہ

زمانِ چاہت کے لاکھ قرنوں میں ایک لمحہ

یہ قید میری، میرے لیے ہے فقط تماشا

قضا ہے جس طرح کھیل کوئی۔

سميح القاسم

قَطَراتُ دمٍ على خريطة الوطن العربيّ

بعث :

تشتجر الاجنحة
يوما ،
و تاتي من اقاصي الزمن
عصفورة فرت من المذبحة
يوما ،
و قالت :
ساعة .. او قرون
تخبر عني جثتي ،
ان يكون
من ريشها الدامي ،
جناح الوطن !

حرمان :

وطني محتقن في

فما حبر يسيل

عند اقدام قتيل ؟ !

وظيفة للموت :

القبور البلّلتها ادمعى من الف عام

لم تزل فى عرف مولاى الخليفه

باب رزق المقرئ الاعمى

و تجار الكلام - -

اقرع الأبواب يا موت

ساعطيك وظيفة ! !

اعتراف فى عزّ الظهيرة :

انا غرست الشجرة

انا احتقرت الثمرة

انا احتطبت جذعها

انا صنعت العود

انا عزفت اللحن

انا كسرت العود

انا افتقدت الثمرة

انا افتقدت اللحن

انا بكيت الشجرة

الخیبة :

وقفت فی الدور
لکی اشتری خبزا لاطفالی
و مرت سنین . .
و حین صار الدور لی ،
قلبوا ما فی یدی من عملة
ساخرین :
تبدلت عملتنا یا حزین !

الامانة :

هیه
یا صوتنا من البیداء قادم
عبر بئر النفط ،
و الحزن المسالم
و البکائیات
و النوم علی معصم انثی
تتقن الذل و انشاد الملاحم

هیه
لی عندك سیف
و خیول و نبوة

لا تعـذبنی "بلاحول و قوة"

لا تعـذبنی

ذراعی یبست

و العبء غاشم . .

فی العواصف :

الموت

یا شعراء جیل الجرح ،

بالمرصاد واقف

الموت

للصوت المکبّل

بین آلاف المعازف

الموت . . قلت

فحاذروا لغط الاکادیمیة الصفراء

و اجتنبوا المتاحف

فی معهد الریح ابتدأنا

فلنکمّل . . فی العواصف !

اکتشاف :

لم اصدّق کل ما قیل

و لکنّی التقیت

بالاحباء و بالاعداء
اعواما طويلة
فاعذريني ان بكيت
دافنا وجهي في صدرك
يا امي القتيلة ..

انتظار :

لم أرجئ الموت
و لكن ليالي الغاب
طالت ،
و خيل الاخوة الاحباب
ماتت على الدرب
و لم تصهل على الابواب
لم ارجئ الموت
انتظاري
يفتح الابواب ! !

* * *

سمیح القاسم

وطن عربی کے نقشے پر

خون کے کچھ چھینٹے

نژادِ نو:

ایک دن ان لہو میں نہائے ہوئے بازوؤں میں نئے بال و پر آئیں گے
وقت کے ساتھ سب گھاؤ بھر جائیں گے
ان فضاؤں میں پھر اس پرندے کے نغمے بکھر جائیں گے
جو گرفتِ خزاں سے پرے رہ گیا
اور جاتے ہوئے ـــــ سرخ پھولوں کے کانوں میں یہ کہہ گیا:
ایک لمحہ ہو یا اک صدی دوستو!
مجھ کو ٹوٹے ہوئے ان پروں کی قسم
اس چمن کی بہاریں میں لوٹاؤں گا
فاصلوں کی فصیلیں گراتا ہوا میں ضرور آؤں گا

محرومی:

میں شہیدوں میں ہوں

پھر بھی میری رگوں میں ابھی تک لہو کا ہے دریا رواں
یہ لہو جو وطن کے لیے وقف تھا۔
اب سیاہی کی صورت گناہِ قلم پہ ہے نوحہ کناں

موت کے ذمے ایک کام:

کتنی صدیوں سے ہم ان مزاروں کی پوجا میں مصروف ہیں
جو بزرگوں کی تقدیس کے نام پر
کچھ کرائے کے مذہب فروشوں کی روزی کا سامان ہیں
بے بصر سائلوں اور بے کار لوگوں کی پہچان ہیں
اے ہوائے فنا، ساعت شام ہے
ایک دفعہ پھر مرے در پہ دستک تو دے — دیکھ تیرے لیے اب مرے پاس بالکل
نیا کام ہے

اعترافِ گناہ:

میں نے جو پیڑ بویا تھا اس کا ثمر
فصل کی فصل جی بھر کے کھایا بھی ہے!
جب وہ بنجر ہوا تو اُسے کاٹ کر
اس کی لکڑی سے سازوں کی تخلیق کی
انھیں پھر سُروں سے سجایا بھی ہے!
ایک اک کر کے پھر خود ہی توڑے رباب
اور سُریں قتل کیں

اس سے تخلیق کی قوّتیں چھین لیں
میرے تہذیب کے پیڑ پر اب کبھی
سُرخ پھولوں کے پرچم نہ لہرائیں گے
آنسوؤں کی زباں پر ہے یہ داستاں
اب گئے دن پلٹ کر نہیں آئیں گے

نامرادی :

برس ہا برس
آنے والے دنوں کے چمکدار خوابوں میں کھویا ہوا
میں قطارِ فنا میں قدم در قدم آگے بڑھتا رہا
اور جب میں زمانے کی دکاں پر
اپنے گھر کے لیے روشنی مول لینے کی خاطر گیا
تو مرے حال پر تیرگی ہنس پڑی
میرے ہاتھوں میں سکّوں کا انبار تھا
ہر دکانِ جہاں کی کرنسی نہ تھی

امانت :

اے صدا !
دامنِ دشت کے اس کنارے سے آتی ہوئی اے صدا !
وہ کنارا جہاں گرم چشموں میں دولت کا سیلاب ہے
بحرِ تسکینِ غم امن کا خواب ہے

لوگ اپنے گناہوں پہ روتے بھی ہیں
اور زلفوں کی خوشبو بھری چھاؤں میں روز سوتے بھی ہیں
داستانِ ہزیمت پہ نادم بھی ہیں!
رزمیہ گیت گانے میں بھی طاق ہیں
دامنِ دشت کے اُس کنارے سے آتی ہوئی اے صدا!
تُو امیں ہے مری اس وراثت کی جو احمدِ مجتبیٰ کی کفِ خاک ہے
(اس کے پیغام کا ورثۂ پاک ہے)
اسپِ شعلہ قدم اور تلوار جو میری قومی شجاعت کے پرچم بھی ہیں
مجھ کو تقدیر کے جبرِ بے نام کی داستاں مت سُنا
میرا دل مت جلا
یہ ہزیمت کا دکھ وہ گراں بوجھ ہے جو ندامت کے لفظوں سے اُٹھتا نہیں
میرا بازو مرے جسم سے کٹ گیا — اے صدا!
دامنِ دشت کے اُس کنارے سے آتی ہوئی اے صدا!

منزلِ سیل:

موت ہی موت ہے
ہر طرف موت ہے
اے ہزیمت زدہ نسل کے شاعرو!
شاعری اور نغمہ گری کے لیے یہ گھڑی موت ہے!
مکتبوں اور دانش کدوں میں کتابوں کے انبار ہیں
اُن کی مُردہ مہک اور بوسیدگی سے کنارا کرو

ان گھٹن سے بھرے تنگ کمروں سے نکلو

یہاں کی ہوا میں چھپی موت ہے!

ہم نے پہلا سبق اپنے صحراؤں کی درس گہ سے لیا

آخری مرحلہ مکتبِ سیل ہے۔

پچھتاوا:

لوگ کہتے رہے

دوستوں، دشمنوں میں چناؤ کرو

میں نے ان کے کہے پر توجہ نہ کی اور رسوا ہوا

اے مری مادرِ مہرباں! میری ارضِ وطن!

میں تیری گود میں سر چھپائے ہوئے آج تیرے کرم کا

طلب گار ہوں، تو مجھے بخش دے

انتظار:

موت کا راستہ میں نے چھوڑا نہیں

منتظر ہوں کہ کب یہ شبِ تارِ صحرا کٹے

اور اترے مرے شہر میں قافلہ مرگ کا

قافلہ مرگ کا

جو ہزیمت کے جنگل کی جانب گیا اور لوٹا نہیں

منتظر ہوں کہ کب میرے ساتھی بھریں
اور ہم دیکھ لیں حوصلہ مرگ کا
شوق کا ساتھ ہو تو مرے دوستو!
دو قدم بھی نہیں فاصلہ مرگ کا

فدوى طوقان

جريمة قتل فى يوم ليس كالايام

الى الطالبة الفلسطينة الشهيدة "منتهى"

و يوم امتطى صهوة العالم الصعب يحمل غصناً بيد
و يحمل سيفاً بيد
و يوم الحبيبة فى الأسر هبّت عليها الرياح محملة باللقاح
مضت "منتهى"
تعلّق اقمار افراحها فى السماء الكُبيرة
و تعلن ان المطاف القديم انتهى
و تعلن ان المطاف الجديد ابتدا.

بغرفتها امها المتعبة
تلملم اوراقها المدرسية :
(حذار العدى يا بنيّة
فعين العدو تصيب) — و ما كذب القلب — كان
عدو الحياة يطاردها فى المسيرة

و ينشب فى عنقها مخلبة

تفتّح مريولها فى الصباح
شقائق حمرا و باقات ورد
و عادت الى الكتب المدرسية كل سطور الكفاح ـــــ التى حذفوها
و عادت الى الصفحات خريطة امس التى مزّقوها
و رفرف "مريولها" راية فى صفوف المدارس ،
رفرف و امتد ، ظلّل فى الضفة المشرئبة
شوارعها المغضبة
و اشجارها المثقلات ، رفرف مريولها راية فى النوافذ ،
فوق سطوح المنازل ، فوق رفوف الدكاكين ،
ظلل فى الضفة المشرئبة
مساجدها و الكنائس ، ظلّلها قبة بعد قبة

و ما قتلوا منتهى
و ما صلبوها
و لكنها خرجت منتهى
تعلق اقمار افراحها فى السماء الكبيرة
و تعلن ان المطاف القديم انتهى
و تعلن ان المطاف الجديد ابتدا

* * *

ایک انوکھے دن میں وارداتِ قتل

شہید فلسطینی طالبہ "منتہا" کے لیے

جس گھڑی وہ چلا
توسنِ وقت کی پیٹھ پر بیٹھ کر
تیغ ایک ہاتھ میں
دوسرے ہاتھ میں لے کے
جس گھڑی اس وطن کے در و بام میں
کُنجِ زنداں کی حسرت بھری شام میں
وہ ہوائیں چلیں
جن میں شامل تھے امکان کے نامہ بر
اس گھڑی منتہیٰ
اپنی خوشیوں کے چاندوں سے جھولی بھرے
سوئے دشتِ فلک، اپنے گھر سے چلی
یہ بتانے کہ اب زندگی کے ہر اک کہنہ انداز کی ہو چکی انتہا

یہ بتانے کہ اب ہو رہی ہے نئے دور کی ابتدا

اس کے کمرے میں اس کی تھکی ماندی ماں
بے خیالی کی پھیلی ہوئی دھند کے درمیاں
اس کی درسی کتابوں کے اوراق سے کھیلتے، کھیلتے
خود کلامی میں تھی،
"میری نورِ نظر
دشمنوں کی نگاہیں بہت تیز ہیں
ان سے کرنا حذر"
اس کا یہ وسوسہ بے حقیقت نہ تھا
واقعی اس گھڑی، خنجرِ بد گہر
اس کی نورِ نظر کے تعاقب میں تھا
اس کے حلقوم پر تھی عدو کی نظر

صبح دم جس گھڑی
اس کے لاشے کے چہرے سے چادر ہٹی
تو گلابوں کی مہکار وحشی ہوئی
اور چادر تلے سُرخ پھولوں کے دستے ہویدا ہوئے
اور درسی کتابوں کے اوراق میں
جرأت و آگہی کے وہ سارے سبق
جو کہ محذوف تھے، پھر نمایاں ہوئے

بے ہنر اور سادہ ورق کی جبیں
ان حدوں کی لکیروں سے روشن ہوئی
جن کا نقشہ عدو کے سیہ ہاتھ سے
پارا پارا ہوا
اس کی چادر سکوں میں پلتی ہوئی
نوجواں آرزوؤں کا پرچم بنی
جو کُھلا اور پھر
از نظر تا نظر پھیلتا ہی گیا
ساحلی بستیوں کے فرازوں پہ چھاتا ہوا
تُند خو شاہراہوں پہ، بوجھل درختوں پہ، سایہ بنا
کھڑکیوں میں، گھروں کی چھتوں پر
دکانوں کے شیلفوں پہ ظاہر ہوا
اور یوں منتہیٰ دیکھتے دیکھتے
اونچے ساحل پر بکھری ہوئی بستیوں کے در و بام پر
آسماں کی طرح خیمہ زن ہو گئی

منتہیٰ لاش ہے پر اسے قتل کس نے کیا؟ کب کیا!
کون ہے جو کہے میں نے مارا اسے
اسے کون مصلوب کرتا کہ جو
سوئے دشتِ فلک
گھر سے نقشِ فنا لے کے رخصت ہوئی

اپنی خوشیوں کے چاندوں سے جھولی بھرے
یہ بتانے کہ اب زندگی کے ہر اک کہنہ انداز کی
ہو چکی انتہا
یہ بتانے کہ اب ہو رہی ہے نئے دور کی ابتدا

اہلِ پاکستان نے اہلِ عرب سے ہمیشہ والہانہ اور بے لوث محبّت کی ہے۔ اس کا بڑا سبب اسلام کا وہ ہمہ گیر رشتہ ہے جس کے دم سے عرب اور پاکستانی صدیوں سے ذہنی اور رُوحانی طور پر مربوط ہیں۔ مگر زمانۂ حال میں سامراج نے عربوں کے ساتھ جو سفاکانہ بدسلوکی کی ہے اس نے ایشیا اور افریقہ کے حرّیت پسندوں کی غیرت کو کچھ اس طرح للکارا ہے کہ اب فلسطین کا مسئلہ محض عربوں کا یا محض مسلمانوں کا مسئلہ نہیں رہا۔ یہ کرۂ ارض کے ان سب انسانوں کا مسئلہ ہے جو آزادی سے محبّت کرتے ہیں اور قوموں کے حقِ خودارادیت کے تحفّظ کو اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج مسئلہ فلسطین کے بارے میں ہر بڑے چھوٹے مُلک کا رویّہ اس کے اخلاقی اور سیاسی معیاروں کی کسوٹی بن چکا ہے۔

کِسی مُلک کا ادب وہاں کے باشندوں کی اُمنگوں، آرزوؤں، محرومیوں اور شکستوں کا آئینہ ہوتا ہے اور گزشتہ ربع صدی سے زیادہ عرصے میں عرب اہلِ قلم نے جس شدّتِ احساس کے ساتھ ادب کے اس منصب کو پُورا کیا ہے، وہ دُنیا بھر کے مزاحمتی ادب کا ایک روشن باب ہے۔ اہلِ پاکستان کو آج کے عرب ممالک کی سوچوں سے متعارف کرانے کا ایک بڑا اور مؤثر ذریعہ وہاں کا ادب ہے مگر ہمارے ہاں بہت کم اصحاب ایسے ہیں جو عربی زبان پر عبور بھی رکھتے ہوں اور معاصر عربی شعر و ادب کی رُوح میں اُتر جانا بھی جانتے ہوں۔ امجد اسلام امجد نے "عکس" کے ذریعے، سیّد محمد کاظم کے سے ادیب اور عالم کے تعاون سے، اس بہت بڑی ضرورت کو پُورا کرنے کا نہایت خوبصورت آغاز کیا ہے۔ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ معاصر عربی شاعری کے اس نمائندہ انتخاب کے معیاری اور بھرپُور منظوم اُردو ترجمے کا ہمہ گیر خیر مقدم کیا جائے گا۔